ਅਰਦਾਸ

ارداس

بابا گورو نانک یونیورسٹی، ننکانہ صاحب کا کثیر اللسانی ادبی مجلہ

ਅਰਦਾਸ

ARDAS

A MULTILINGUAL MAGAZINE OF BGNU

دیباچہ

اَرداس۔۔۔لفظوں کی وہ دعا جو دل سے نکل کر شعور کی دنیا کو منور کر دے۔

اَرداس بابا گورونانک یونیورسٹی، ننکانہ صاحب کا سالانہ کثیر اللسانی ادبی مجلہ ہے جو علم، ادب، ثقافت اور تخلیقی اظہار کے فروغ کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ مجلہ یونیورسٹی کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں اور فکری روایتوں کے مابین رابطے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اَرداس اپنے دائرۂ کار میں اردو، پنجابی، انگریزی اور دیگر زبانوں کی تخلیقی اور تحقیقی کاوشوں کو یکجا کرتے ہوئے ایک جامع ادبی منظرنامہ پیش کرتا ہے۔

اَرداس کا بنیادی مقصد نوجوان نسل میں مطالعے، تحقیق، تنقیدی شعور اور تخلیقی اظہار کی روایت کو فروغ دینا ہے۔ یہ مجلہ طلبہ، اساتذہ، محققین، ادیبوں اور دانش وروں کو ایک ایسا علمی وادبی پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے جہاں وہ اپنی تخلیقات، افکار اور تحقیقات کو پیش کر سکیں۔ اس طرح اَرداس نہ صرف ادبی صلاحیتوں کی آبیاری کرتا ہے بلکہ علمی مکالمے اور فکری ارتقا کے لیے بھی سازگار ماحول فراہم کرتا ہے۔

مجلے میں شاعری، افسانہ، مضمون، تحقیق، تنقید، سفرنامہ، انٹرویو، تراجم اور دیگر ادبی اصناف کو شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی وبین الاقوامی علمی، ادبی اور ثقافتی موضوعات پر مبنی تحریروں کو بھی جگہ دی جاتی ہے تاکہ قارئین کو متنوع فکری اور ادبی تجربات سے روشناس کرایا جاسکے۔ اس تنوع کے ذریعے اَرداس ادب اور دانش کے مختلف زاویوں کو ایک مشترکہ فکری افق پر جمع کرتا ہے۔

اَرداس محض ایک ادبی مجلہ نہیں بلکہ علم وادب کے فروغ، ثقافتی ورثے کے تحفظ اور انسانی اقدار کی ترویج کا ایک بامقصد سفر ہے۔ یہ مجلہ بابا گورونانک یونیورسٹی کے اس عزم کا مظہر ہے کہ تعلیم، تحقیق اور تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے ایک روشن، باشعور اور مہذب معاشرے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا جائے۔ اَرداس اسی عزم کے ساتھ ادب، علم اور انسان دوستی کے چراغ کو نسل در نسل روشن رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس میگزین میں طلبہ اور دیگر مصنفین کی تحریروں کو حتی الامکان ان کے اصل اندازِ تحریر اور اسلوب کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ تحریروں میں زبان وبیان کی مناسبت، قواعد یا اسلوب سے متعلق کسی قسم کی غیر ضروری ترمیم نہیں کی گئی، تاکہ ہر لکھاری کا منفرد انداز، اظہار اور تحریری شناخت برقرار رہے۔

ਅਰਦਾਸ

اَرداس

بابا گورونانک یونیورسٹی، ننکانہ صاحب کا کثیر اللانی ادبی مجلہ

سرپرستِ اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران، وائس چانسلر
بابا گورونانک یونیورسٹی، ننکانہ صاحب

مجلسِ ادارت

مجلہ آر داس کی مجلسِ مشاورت ممتاز دانشوروں، محققین، اساتذۂ کرام، ادیبوں اور اہلِ قلم پر مشتمل ہے جو علمی و ادبی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ یہ مجلس امن، رواداری، محبت، خدمتِ خلق اور بین الثقافتی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے عزم کے ساتھ مجلے کے معیار اور وقار کو برقرار رکھنے میں معاون ہے۔

مدیرِ اعلیٰ : ڈاکٹر قاسم شفیق | شعبۂ انگریزی زبان وادب

معاون مدیران :

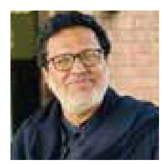

ڈاکٹر سید غضنفر حسین
شعبۂ پنجابی زبان وادب

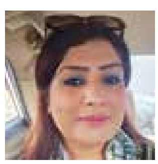

ڈاکٹر سمیرا نعیم
شعبۂ کیمسٹری

معاون مدیرانِ ادارت :

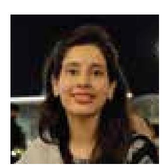

مس حنا سمرین
شعبۂ نفسیات

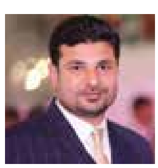

ڈاکٹر رضوان علی
شعبۂ پنجابی زبان وادب

منتظمِ ادارت :

ڈاکٹر محمد یاسر سعید
شعبۂ مینجمنٹ سائنسز

قومی و بین الاقوامی مشاورتی بورڈ

بین الاقوامی اراکین

پروفیسر ڈاکٹر کولیٹ مورو

پرڈیو یونیورسٹی، انڈیانا، امریکہ

پروفیسر ڈاکٹر ماریہ اسٹیٹن

یونیورسٹی آف میری لینڈ گلوبل کیمپس، جاپان

ڈاکٹر ہرجندر سنگھ دلگیر

ڈائریکٹر، گورونانک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، برطانیہ

پروفیسر ڈاکٹر پرمندر جیت کور

پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، بھارت

پروفیسر ڈاکٹر انور چراغ

پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، بھارت

پرمندر سوڈھی

معروف ادیب، اوساکا، جاپان

خالد حسین

معروف ادیب، جموں و کشمیر

قومی اراکین

پروفیسر ڈاکٹر نبیلہ رحمان

جامعہ پنجاب، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر مظہر حیات

رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد

پروفیسر ڈاکٹر علی عثمان

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

پروفیسر ڈاکٹر مجاہدہ بٹ

لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر غلام علی

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان عابد

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر طیب عثمانی

بابا گورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب

بلال احمد بھٹی

بابا گورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب

ڈاکٹر سائرہ اختر

گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈاکٹر صباحت پروین

یونیورسٹی آف ایگریکلچر، فیصل آباد

ڈاکٹر عائشہ اشرف

یونیورسٹی آف جھنگ، جھنگ

ڈاکٹر عبدالواحد

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر حکم علی بریرو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

مندرجات

۱	ننکانہ صاحب: عقیدت، تہذیب اور انسانیت کے روشن سفر کی داستان	ڈاکٹر ممتاز احمد	1
۲	بابا گورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب	ڈاکٹر سمیرا نعیم	3
۳	دورِ جدید میں اتحاد بین المذاہب: بنیادی اصول	ڈاکٹر محمد طیب عثمانی	5
۴	بنیادی سائنسی علوم میں رجحان کی کمی	ڈاکٹر عامر عباس	8
۵	سفر سویک لیک، ایک ناقابل فراموش داستان	ماہ رخ فضل	11
۶	جوتے (افسانہ)	محمد جمیل اختر	15
۷	دیو اور دیوانہ (ترجمہ: اطالوی لوک کہانی)	ڈاکٹر سلیم اختر ڈھیرہ	16
۸	علم، صنعت اور فطرت کے سنگم کی جانب ایک سفر	عیشہ لیاقت	18
۹	منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی: ایک گمنام کلاسیکی شاعر کی بازیافت	آصف اقبال	20
۱۰	تیرا وجود	ڈاکٹر سلیم اختر ڈھیرہ	23
۱۱	آزاد نظم	الفت پروین	23
۱۲	مستقبل میرے ہاتھوں میں	عروج فاطمہ	25
۱۳	محبت ہے	ثنا اشرف	25
۱۴	زیست سفر ہے	ڈاکٹر سمیرا نعیم	26
۱۵	غزل	میاں آفتاب احمد	26
۱۶	سائنس فکشن کی دنیا میں ٹیکنالوجی کی حقیقت	گوہر منیر مکھی	27
۱۷	معزز وائس چانسلر، پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کے ساتھ خصوصی گفتگو		31
۱۸	خاموش تصویریں بولتی کہانیاں		35
۱۹	ڈاکٹر عثمان یونس، کنوینر داخلہ کمیٹی، کے ساتھ ایک خصوصی نشست	ڈاکٹر محمد یاسر سعید	46
۲۰	پنجابی ثقافت		48
۲۱	تُرداویلا	ڈاکٹر قاسم شفیق	49
۲۲	گلاں کردے لفظ	ڈاکٹر سید غضنفر حسین بخاری	50
۲۳	پریتم داس ٹھاکر دا فارسی اکھراں وچ اَن چھپیا قصہ پُورن بھگت	ڈاکٹر واصف لطیف	51
۲۴	خالی ہتھ	شہزونیہ اشفاق	53
۲۵	نظماں ہتھی پے گیئاں	ڈاکٹر سید غضنفر حسین بخاری	53
۲۶	تھانے دار دے دراز وچ پیا موبائل	فخر النساء	54

۲۷	ਜੀਵਨ ਸਫਲਤਾ ਲਈ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਜ਼ਰੂਰੀ	ਸੁਰਿੰਦਰ ਮੰਡ	55
۲۸	CULTURE & LIBERAL ARTS		59
۲۹	Marge Piercy's Woman on the Edge of Time (A Review)	Dr Tasneem Kousar	67
۳۰	World War and World Peace in the Age of Digital Capitalism by Christian Fuchs	Fakiha Noor	68
۳۱	I Am an Arab: Poetry, Identity and Resistance in Marwan Makhoul	Qaisar Waheed	69
۳۲	Future of English Studies in the age of AI in Pakistan	Dr. Zia Ahmed	72
۳۳	The Art of Paying Attention	Muhammad Saad Aslam	74
	A Tribute to Late Dr. Naseeb Ahmad	Dr. Hashim Farooq	

ننکانہ صاحب

عقیدت، تہذیب اور انسانیت کے روشن سفر کی داستان

ڈاکٹر ممتاز احمد

ننکانہ صاحب برصغیر کی اُن نادر سرزمینوں میں شمار ہوتا ہے جہاں تاریخ، روحانیت، ثقافت اور تہذیب ایک دوسرے میں اس طرح مدغم نظر آتے ہیں کہ ان کی الگ الگ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لاہور کے شمال مغرب میں واقع یہ ضلع محض ایک جغرافیائی اکائی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی مذہبی، ثقافتی اور تاریخی روایت کا ایک اہم حوالہ ہے۔ آج دنیا بھر میں ننکانہ صاحب کو بابا گورو نانک کی جائے پیدائش کے طور پر جانا جاتا ہے، تاہم اس خطے کی تاریخ صرف سکھ مذہب کی ابتدا تک محدود نہیں بلکہ اس کی جڑیں پنجاب کی قدیم تہذیبی روایت، زرعی معیشت، صوفیانہ ثقافت اور علمی ارتقا تک پھیلی ہوئی ہیں۔

قدیم تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ننکانہ صاحب کا علاقہ پنجاب کے اُن زرخیز میدانوں کا حصہ رہا ہے جو صدیوں سے انسانی آبادی، زراعت اور تجارتی سرگرمیوں کے مراکز رہے ہیں۔ دریائے راوی اور اس کے معاون آبی نظاموں کے قرب نے اس خطے کو زرعی اعتبار سے ہمیشہ اہمیت بخشی۔ مختلف ادوار میں یہاں مقامی ریاستوں، دہلی سلطنت، مغلیہ سلطنت اور بعد ازاں سکھ سلطنت اور برطانوی راج کے سیاسی اثرات مرتب ہوتے رہے۔ اگرچہ ننکانہ صاحب کسی بڑے فوجی یا سیاسی دارالحکومت کے طور پر معروف نہیں رہا، لیکن یہ ہمیشہ پنجاب کی دیہی تہذیب، زرعی پیداوار اور ثقافتی زندگی کا ایک فعال حصہ رہا ہے۔

اس شہر کی عالمی شناخت پندرھویں صدی کے عظیم روحانی پیشوا بابا گورو نانک کی ولادت سے وابستہ ہے۔ 1469ء میں رائے بھوئی دی تلونڈی نامی قصبے میں بابا گورو نانک دیو جی کی پیدائش ہوئی۔ بعد ازاں انہی کے نام کی نسبت سے اس مقام کو ننکانہ صاحب کہا جانے لگا۔ بابا گورو نانک نے اپنے عہد میں مذہبی تنگ نظری، سماجی تفریق اور طبقاتی امتیازات کے خلاف ایک ایسی فکری روایت کی بنیاد رکھی جس نے پورے برصغیر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کی تعلیمات نے انسانی مساوات، محنت، دیانت، خدمتِ خلق اور روحانی آزادی کو بنیادی اہمیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ ننکانہ صاحب صرف سکھ مذہب کے

ماننے والوں کے لیے ہی مقدس نہیں بلکہ بین المذاہب احترام اور انسانی اخوت کی علامت کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں یہ خطہ سکھ تاریخ کے اہم مراکز میں شمار ہونے لگا۔ یہاں متعدد گردوارے تعمیر ہوئے جن میں گردوارہ جنم استھان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بابا گورو نانک کی ولادت ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ننکانہ صاحب دنیا بھر کے سکھ یاتریوں کے لیے ایک روحانی مرکز بن گیا۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل بھی ہزاروں زائرین یہاں حاضر ہوتے تھے اور تقسیمِ ہند کے بعد بھی اس شہر کی مذہبی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ننکانہ صاحب کی تاریخ کا ایک اہم باب 1921ء کے سانحۂ ننکانہ سے وابستہ ہے۔ فروری 1921ء میں گردوارہ اصلاحی تحریک کے دوران پیش آنے والے اس واقعے میں متعدد سکھ کارکن جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس سانحے نے نہ صرف سکھ برادری بلکہ پورے برصغیر میں مذہبی اداروں کے انتظام و انصرام اور عوامی حقوق کے حوالے سے ایک نئی بحث کو جنم دیا۔ آج بھی یہ واقعہ سکھ تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل تصور کیا جاتا ہے اور ننکانہ صاحب کی تاریخی شناخت کا حصہ ہے۔

برطانوی دور میں ننکانہ صاحب کے گرد و نواح میں زرعی ترقی کے لیے نہری نظام متعارف کروایا گیا جس نے علاقے کی معیشت کو نئی جہت دی۔ پنجاب کی مشہور نہری کالونیوں میں اس خطے کو نمایاں مقام حاصل رہا۔ زرعی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہاں نئی آبادیاں قائم ہوئیں اور تجارتی سرگرمیوں میں وسعت پیدا ہوئی۔ گندم، چاول، گنا اور دیگر فصلوں کی پیداوار نے اس خطے کو پنجاب کی زرعی معیشت کا اہم حصہ بنا دیا۔

ثقافتی اعتبار سے ننکانہ صاحب پنجاب کی مشترکہ تہذیبی روایت کا نمائندہ شہر ہے۔ یہاں پنجابی زبان، لوک ادب، موسیقی، روایتی دستکاریوں اور دیہی ثقافت کی مضبوط جڑیں موجود ہیں۔ مقامی میلوں، مذہبی تقریبات اور ثقافتی اجتماعات میں اس خطے کی تہذیبی رنگا رنگی نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ پنجابی زبان و ادب کے فروغ میں بھی اس علاقے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں کی عوامی روایت میں صوفیانہ فکر، لوک دانش اور مذہبی رواداری کے عناصر نمایاں طور پر موجود ہیں۔

تعلیمی اعتبار سے ننکانہ صاحب نے گزشتہ چند دہائیوں میں نمایاں ترقی کی ہے۔ طویل عرصے تک یہ علاقہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی کمی کا شکار رہا، جس کے باعث طلبہ کو لاہور، فیصل آباد اور دیگر بڑے شہروں کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ تاہم اکیسویں صدی میں تعلیم کے فروغ کے لیے حکومتی اور سماجی سطح پر متعدد اقدامات کیے گئے جن کے نتیجے میں تعلیمی اداروں کی تعداد اور معیار دونوں میں اضافہ ہوا۔ اس سلسلے میں بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کا قیام ایک تاریخی پیش رفت ثابت ہوا۔ اس جامعہ نے نہ صرف مقامی طلبہ کے لیے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھولے بلکہ ننکانہ صاحب کو ایک ابھرتے ہوئے علمی مرکز کے طور پر بھی متعارف کروایا۔

آج ننکانہ صاحب کی اہمیت صرف مذہبی سیاحت یا تاریخی ورثے تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ زرعی تحقیق، تعلیم، بین المذاہب مکالمے، ثقافتی مطالعات اور علاقائی ترقی کے نئے امکانات کا حامل خطہ بن چکا ہے۔ دنیا بھر سے آنے والے زائرین، محققین، تاریخ دان اور طلبہ اس شہر کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کو سمجھنے کے لیے یہاں کا رخ کرتے ہیں۔ اس طرح ننکانہ صاحب ماضی کی عظیم روایات اور مستقبل کی نئی امیدوں کے درمیان ایک زندہ پل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

ننکانہ صاحب کی اصل طاقت اس کی اسی متنوع شناخت میں پوشیدہ ہے۔ یہ ایک ایسا شہر ہے جہاں تاریخ محض یادداشت نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کا حصہ ہے، جہاں روحانیت ثقافت سے ہم آہنگ ہے، جہاں زراعت معیشت کی بنیاد ہے، اور جہاں تعلیم و تحقیق مستقبل کی سمت متعین کر رہی ہیں۔ یہی خصوصیات اسے پنجاب کے دیگر تاریخی شہروں سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے پاکستان کے ثقافتی، تاریخی اور علمی نقشے پر ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب

علم کی روشنی، مستقبل کی تعمیر

ڈاکٹر سمیرا النعیم، شعبہ کیمسٹری

بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب پاکستان کے اُن اہم تعلیمی منصوبوں میں شمار کی جاتی ہے جنہیں نہ صرف علمی ترقی بلکہ ثقافتی، تاریخی اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے بھی قائم کیا گیا۔ یہ جامعہ ضلع ننکانہ صاحب میں قائم ہے جو دنیا بھر میں بابا گورو نانک کی جائے پیدائش کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ حکومتِ پنجاب نے اس ادارے کے قیام کا اعلان بابا گورو نانک دیو جی کے 550ویں جنم دن کی تقریبات کے موقع پر کیا، جبکہ 28اکتوبر 2019ء کو اُس وقت کے وزیرِ اعظم پاکستان نے اس یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس تقریب میں ملکی و غیر ملکی شخصیات، سکھ یاتریوں، حکومتی نمائندوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔

یونیورسٹی کے قیام کا بنیادی مقصد ننکانہ صاحب کو ایک ایسے علمی مرکز کے طور پر متعارف کروانا تھا جہاں جدید تعلیم، تحقیق، ثقافت اور تاریخ کو یکجا کیا جا سکے۔ 2جولائی 2020ء کو پنجاب اسمبلی نے ”بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب ایکٹ 2020“ کیا جس کے بعد یہ ادارہ باقاعدہ طور پر ایک پبلک سیکٹر یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ حکومتِ پنجاب نے اس منصوبے کے لیے ابتدائی طور پر اربوں روپے کے فنڈز مختص کیے اور اس کے لیے آدم پورہ، ننکانہ صاحب میں 107ایکڑ کی وسیع اراضی فراہم کی گئی۔ منصوبے کو مرحلہ وار مکمل کرنے کا اعلان کیا گیا تاکہ مستقبل میں اسے بین الاقوامی معیار کی جامعہ بنایا جا سکے۔

بابا گورو نانک یونیورسٹی کے ابتدائی انتظامی اور تدریسی ڈھانچے کی تشکیل میں ڈاکٹر محمد افضل، سابق وائس چانسلر، بابا گرونانک یونیورسٹی نے بطور پہلے وائس چانسلر اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران، وائس چانسلر، بابا گورونانک یونیورسٹی نے جامعہ کی قیادت سنبھالی اور ادارے کی تدریسی، تحقیق اور انتظامی سرگرمیوں کو وسعت دی۔ جامعہ کے قیام کے ابتدائی عرصے میں عارضی کیمپس کے ذریعے تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا جبکہ مستقل کیمپس کی تعمیر کے لیے جدید منصوبہ بندی پر کام شروع کیا گیا۔

بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کی مختصر مگر قابلِ ذکر تاریخ میں پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کی قیادت ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے جامعہ کی بھاگ دوڑ ایسے وقت میں سنبھالی جب ادارہ اپنے ابتدائی ارتقائی مراحل سے گزر رہا تھا اور اسے ایک واضح تعلیمی سمت اور مضبوط ادارہ جاتی شناخت کی ضرورت تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران نے اپنی علمی بصیرت، انتظامی صلاحیت اور اعلیٰ تعلیمی تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے جامعہ کے تعلیمی نظام میں بنیادی اور دیرپا تعلیمی نتائج پر مبنی نظام تعلیم

(Outcome-Based Education-OBE)

جیسی اصلاحات متعارف کروائیں اور اس کے نفاذ کو انہوں نے یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی کا مرکزی ستون بنایا۔ ان کے وژن کے مطابق تعلیم کا اصل مقصد محض معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ ایسے فارغ التحصیل افراد کی تیاری ہے جو علم، مہارت، تنقیدی فکر، قیادت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے آراستہ ہوں۔ اسی سوچ کے تحت جامعہ کے تمام تعلیمی پروگراموں کو پروگرام کے متوقع تعلیمی نتائج

Program Learning Outcomes (PLOs)

اور کورس کے تعلیمی نتائج

Course Learning Outcomes (CLOs)

کے ساتھ مربوط کیا گیا، نصاب کا از سرِ نو جائزہ لیا گیا، تدریسی اور امتحانی نظام کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا گیا اور معیارِ تعلیم کو بین الاقوامی رجحانات کے مطابق استوار کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کی سربراہی میں فیکلٹی ڈویلپمنٹ، کوالٹی انہانسمنٹ، ڈیجیٹلائزیشن، تحقیقی سرگرمیوں اور ادارہ جاتی منصوبہ بندی کے شعبوں میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی۔ یوں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران نے بابا گورو نانک یونیورسٹی کو محض ایک نئے قائم شدہ ادارے کے طور پر چلانے کے بجائے اسے ایک ایسی جدید جامعہ میں تبدیل کرنے کی بنیاد رکھی ہے جو علم، تحقیق، معیار اور جدت کو اپنی شناخت کا حصہ بنا رہی ہے۔ ان کی قیادت میں جامعہ نے نہ صرف اپنی تعلیمی سمت کو واضح کیا بلکہ مستقبل کے لیے ایک مضبوط اور پائیدار علمی ڈھانچہ بھی تشکیل دیا ہے۔

یہ جامعہ اس لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ اس کا قیام صرف ایک تعلیمی ضرورت کے تحت عمل میں نہیں آیا بلکہ اسے پاکستان کے مثبت تشخص، مذہبی رواداری اور ثقافتی احترام کی علامت کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ ننکانہ صاحب ہر سال دنیا بھر سے آنے والے ہزاروں سکھ یاتریوں کا مرکز بنتا ہے، اور ایسے تاریخی شہر میں ایک جدید یونیورسٹی کا قیام پاکستان کی تعلیمی اور ثقافتی پالیسی کا اہم حصہ تصور کیا جاتا ہے۔

بابا گورو نانک یونیورسٹی میں مختلف شعبہ جات کے قیام کے ذریعے جدید اور معیاری تعلیم فراہم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جامعہ میں کمپیوٹر سائنس، بزنس ایڈمنسٹریشن، میتھمیٹکس، باٹنی، زولوجی، کیمسٹری، فزکس، انگریزی زبان و ادب، پنجابی زبان و ادب، اسلامیات اور فائن آرٹس سمیت مختلف علوم و فنون کے پروگرامز متعارف کروائے گئے ہیں۔ ان شعبہ جات کے قیام کا مقصد طلبہ کو عصرِ حاضر کے علمی اور پیشہ ورانہ تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیم فراہم کرنا اور انہیں تحقیق، اختراع اور عملی میدانوں میں مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل بنانا ہے۔ جامعہ کی انتظامیہ ایک ایسے تعلیمی ماحول کی تشکیل کے لیے کوشاں ہے جہاں بنیادی علوم، زبان و ادب، سائنسی تحقیق اور جدید ٹیکنالوجی باہم مربوط انداز میں فروغ پائیں۔ ان شعبہ جات کے ذریعے نہ صرف خطے کے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع میسر آ رہے ہیں بلکہ مقامی اور قومی سطح پر علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے فروغ میں بھی اہم پیش رفت ہو رہی ہے۔

بابا گورو نانک یونیورسٹی میں تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ جامعہ میں مختلف ادبی تقریبات، مشاعرے، سیمینارز، سپورٹس پروگرامز اور ثقافتی میلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے جن میں طلبہ بھرپور شرکت کرتے ہیں۔ ان سرگرمیوں کا مقصد طلبہ کی ہمہ جہت شخصیت سازی

سازی اور ان میں قائدانہ صلاحیتوں کو فروغ دینا ہے۔
جامعہ میں مختلف علمی و ادبی سوسائٹیز بھی فعال کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان سوسائٹیز کے ذریعے طلبہ کو تخلیقی اظہار، مطالعے کے فروغ اور تحقیقی سرگرمیوں کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ رسالہ "ارداس" بھی اسی علمی اور ادبی روایت کا ایک اہم حصہ ہے جو طلبہ اور اساتذہ کی تخلیقی و تحقیقی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے کا ذریعہ بنتا جا رہا ہے۔
یونیورسٹی کی انتظامیہ جدید تعلیمی سہولیات کی فراہمی کے لیے بھی کوشاں ہے۔ لائبریری، کمپیوٹر لیبارٹریز، تحقیقی مراکز، ڈیجیٹل وسائل اور جدید تدریسی طریقہ کار کو مرحلہ وار جامعہ کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ مستقبل کے منصوبوں میں جدید ہاسٹلز، تحقیقی بلاکس، آڈیٹوریم، سپورٹس کمپلیکس اور بین الاقوامی معیار کے تعلیمی مراکز کا قیام بھی شامل ہے۔
بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب خطے میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اس جامعہ نے نہ صرف ننکانہ صاحب بلکہ گرد و نواح کے اضلاع کے طلبہ کو معیاری تعلیم کے مواقع فراہم کیے ہیں بلکہ نوجوان نسل کو جدید علمی اور پیشہ ورانہ میدانوں میں آگے بڑھنے کے لیے ایک مؤثر پلیٹ فارم بھی مہیا کیا ہے۔
یہ جامعہ مستقبل میں تحقیق، بین الاقوامی روابط، ثقافتی مطالعات اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اپنی جغرافیائی، تاریخی اور روحانی اہمیت کی وجہ سے بابا گورو نانک یونیورسٹی نہ صرف پنجاب بلکہ پورے پاکستان کے تعلیمی منظر نامے میں ایک منفرد مقام حاصل کر رہی ہے۔

دورِ جدید میں اتحاد بین المذاہب: بنیادی اصول

ڈاکٹر محمد طیب عثمانی، شعبہ علوم اسلامیہ

انسان اپنی زندگی کے دونوں پہلوؤں (انفرادی و اجتماعی) کے لحاظ سے متعدد محرکات کی بنیاد پر متنوع منازل طے کر رہا ہے بالخصوص گزشتہ تین صدیوں کے دوران برق رفتار ترقی کی وجہ سے دنیا کے مختلف ممالک و تہذیبوں میں منقسم انسان، انسانی تہذیب و معاشروں اور ممالک نے کئی نئے تجربات کا سامنا کیا ہے۔ انسانی تجربات کے سلسلے نے انسانی معاشروں اور تہذیبوں کو اپنے داخلی و اندرونی سطح پر چیزوں کے احیائے نو کی فکر سے وابستہ کیا۔ جس کے لیے انسانی معاشروں نے انسانوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کرنے پر اور عملی اقدامات کی نئی راہوں کو دریافت کرنے پر لگا دیا ہے۔ معاصر سائنسی و علمی ترقی کی وجہ سے دنیا سکڑ کر ایک عالمی گاؤں کی شکل اور سماج ایک عالمگیری حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے معاشرے، تہذیبیں فکری، سیاسی، سماجی، قانونی اور مذہبی پیش آمدہ مسائل سے دوچار ہیں۔ ایسے میں انفرادیت و اجتماعیت کے تناظر میں گروہ پسندی، نسلی، لسانی، مذہبی اور سماجی و سیاسی تعصبات اور ریاستی مفادات جیسے پہلوؤں نے مختلف اقوام کے عالمی سطح پر تناؤ، منافرت، جنگ و جدل کی کیفیت طاری کر رکھی ہے، جس کی وجہ سے انسان، انسانی سماج، انسانی تہذیبیں اپنی اپنی بقاء کے اعتبار سے خطرناک حالات سے دوچار ہیں۔ اسلام انسانوں، انسانی معاشروں اور دنیا کی اقوام کو نا صرف متحد کر سکتا ہے بلکہ اس میں فسادات و مسائل سے نجات دلانے کی صلاحیت موجود ہے اور دین متین میں ایسی تعلیمات موجود ہیں جن میں احترام انسانیت، انسانیت کی فوز و فلاح، انسان اور ان کی اقوام کے مابین بھلائی کے فروغ، انسانی خدمت اور پرامن بقائے باہمی پر زور دیا گیا ہے۔

اتحاد بین المذاہب کی صورتیں

اتحاد بین المذاہب کی دو صورتیں سامنے آتی ہیں :

تمام مذاہب کو اپنی اپنی جگہ صحیح قرار دیتے ہوئے مبینہ طور پر ان کی اچھائیوں اور خوبیوں کو ایک مشترکہ مذہب کے طور پر سمو لیا جائے، اور یہ عمل اس مقصدِ خاص کے تحت ہو کہ تمام مذاہب کی اچھائیوں کو جمع ہو کر سامنے ابھریں۔ اسے معاصر علمی حلقوں میں "اتحاد بین المذاہب" کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اس مفہوم میں اتحاد بین المذاہب درحقیقت "وحدت ادیان" کے مثل و مترادف ہے۔

سماجی اشتراک کی خاطر مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ زندگی بسر کر رہے ہوں اور انہوں نے اپنے اپنے مذہب کے فکری و عباداتی دائرے میں رہتے ہوئے اکٹھے رہنے کے امکانات اور وسعتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اکٹھے ہی رہنا بھی ہو۔ اشتراک سماج اور پرامن بقائے باہمی پر مل بیٹھیں اور ان کی گفتگو کا بنیادی مدعا یہ ہو کہ وہ کن معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ چل سکتے ہیں اور کہاں کہاں اشتراک و بقاء کی احترام انسانیت و مذہب کے ساتھ گنجائش پیدا کر سکتے ہیں اور جہاں وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دینیاتی تقاضوں کی وجہ سے باہم تعاون نہیں کر سکتے تو وہاں ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور تصادم و فساد سے بچنے کے لیے کن کن راستوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ دوسرے الفاظ میں اس عمل کو "بین المذاہب سماجی ہم آہنگی" اور "پُرامن بقائے باہمی" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ عمل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پسندیدہ امور میں شمار ہوتا ہے اور شریعت کے عین مقتضاء کے عین مطابق ہے۔

بین المذاہب کے اصول

معاشرے میں خوشگوار و سازگار ماحول اور پُرامن بقائے باہمی کے لیے ہم آہنگ ہونا انتہائی ضروری ہے۔ مذاہب، تہذیبوں اور انسانی سماجوں کے مابین اشتراک عمل و برداشت کا واحد حل "بین المذاہب ہم آہنگی" کی بنیاد پر اتحاد بین المذاہب کا قیام ہے۔ ہم آہنگی کے فروغ کے لیے اسلام نے کلیدی و اساسی درجے کے اصول قائم کیے تاکہ ان کے دیرپا فوائد و ثمرات معاشروں پر مرتب ہو سکیں اور سازگار ماحول میں انسانی تعامل کی اُٹھان میں اشتراک و بقائے دائمی کارفرما رہیں۔ اسلامی نے درج ذیل ہم اساسی پہلوؤں کو اس اہم مقصدِ سماج کے بطور اصول متعارف کروایا

- احترام انسانیت
- امن
- مذہبی رواداری
- احترام مذاہب
- مذہبی آزادی

احترام انسانیت

انسان دنیا میں خدائے متعال کا نائب و خلیفہ ہے۔ اس خلیفہ کا احترام و تکریم اسلام کی تعلیمات کی اہم جزء ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ"

ترجمہ: اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت دی۔

اس شرف و عزت کا تعلق رنگ و نسل، علاقہ و زبان، مذہب و ملت کی بنیاد پر فائز کرنا نہیں ہے بلکہ بحیثیت انسان اس کی قدر و منزلت اور اس کا وجود پوری انسانیت کا وجود اور اس کی ہلاکت پوری انسانیت کی ہلاکت اسلام میں ملحوظ ہے۔

امن

اسلام امن و سلامتی کا نام ہے اس کے ہر عمل سے سلامتی، تحفظ، اطمینان کی شعاعیں پھوٹتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ امن کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ نبی رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل انسان جس بے سکونی، بے اطمینانی اور بدامنی کا شکار تھا اسلام نے انہی رذائل کو دور کر اُسوۂ حسنہ کی صورت میں محبت، اطمینان، تحفظ، مروت، امن و سلامتی کا متبادل نظام فراہم کیا۔ قرآن کریم میں امن سے متعلق بڑے جامع ہدایات موجود ہیں جن میں لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ پر زور دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ عدل و انصاف و رواداری دوسروں پر ظلم کے روک تھام کی تلقین کرتا ہے آپس میں باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے ساتھ ساتھ اخلاق حسنہ پر زور دیتا ہے تاکہ امن وامان کے نعمت سے انسان اور معاشرہ مالامال ہو جائے۔ ان تعلیمات میں ملنے والے امن و سلامتی اور تحفظ و سکون کا تعلق فقط مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ یہ عمومی احکام ہیں اور ان سے غیر مسلم بھی برابری کی بنیاد پر بہرور ہوں گے۔

مذہبی رواداری

رواداری ایسی صفت ہے جو تعصب ، انفرادیت، جبر ، زبردستی، ہٹ دھرمی کے متضاد ہو اور جس میں کسی فعل کو رعائیت کے ساتھ مباح اور جائز رکھا جائے۔ جس میں دوسرے ادیان کے افراد کے تصورات و نظریات کو تحمل سے برداشت کیا جائے۔ غیر مسلموں سے رواداری کے لیے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خود مہمان نوازی کیا کرتے ہیں ، ایک حبشہ سے وفد آیا تو ارشاد فرمایا:

" إنھم کانوا لأصحابي مکرمین، وإني أحب أن أکافئھم "

ترجمہ: یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کا اکرام کرنے والے تھے اسی لیے مجھے پسند ہے کہ میں خود ان کی مہمان نوازی کروں۔

احترامِ عقائد: "اور (اے ایمان والو!) اللہ کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں، انہیں بُرا بھلا نہ کہو۔"

احترامِ معابد (عبادت گاہیں): ان کی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی، نہ ان کے حقوق میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے گی۔

مذہبی شخصیات اور مذہبی اداروں کا احترام: ان کی مورتیاں (مجسمے) خراب نہیں کیے جائیں گے ، نہ کسی اسقف (بشپ) کو اس کے منصب سے ہٹایا جائے گا، نہ کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے روکا جائے گا، اور نہ ہی کسی گرجا گھر (کنیسہ) کے منتظم کو اس کے عہدے سے معزول کیا جائے گا۔

شعبۂ اسلامیات کی بابا گرونانک جنم استھان کے لنگر خانے میں آمد

احترامِ مذاہب وادیان

جہاں تک ادیان و مذاہب اور ان کی بڑی شخصیات کے احترام کا تعلق ہے، یہ اسلام کے بنیادی اساسی احکام کی روشنی میں مسلمہ حیثیت کا متحمل ہے ، وہیں بین الاقوامی مسلملات اور اخلاقیات کا حصہ بھی بن چکا ہے کہ ایک دوسرے کے مذہب کا اور اس کی مذہبی شخصیات کا احترام کیا جائے اور ان کی توہین کر کے ان کے ماننے والوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے۔ اس اہم اساسی اصول کے تین اہم پہلو ہیں

احترامِ جان و شخصیات: غداری نہ کرو، دھوکہ نہ دو، لاشوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ بچوں، عورتوں، بزرگوں یا عبادت میں مشغول مذہبی پیشواؤں (پادریوں، راہبوں وغیرہ) کو قتل کرو۔

مذکورہ دلائل اس بات کی شاہد ہیں کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو مکمل احترام و تحفظ حاصل ہوگا۔

مذہبی آزادی

دیگر اہل مذاہب کے لوگوں پر اپنے عقائد تبدیل کرنے یعنی اسلام قبول کرنے کے لیے کسی جبر واکراہ سے کام لیتا ہے، نہ دباؤ ڈالتا ہے بلکہ انہیں اعتقادات و عبادات اور مذہبی مراسم وشعائر میں مکمل آزادی حاصل ہوگی، ان کے اعتقاد اور مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کی جائے گی، ان کے سیناگاگ، گرجوں، مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہیں کیا جائے گا۔ مذہبی آزادی کے حوالے سے اولین دستوری دستاویز "میثاقِ مدینہ" ہے۔ اس معاہدے میں اس امر کی وضاحت کردی گئی کہ غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی ہوگی۔ چنانچہ ایک دفعہ کے الفاظ یہ ہیں

"لِلْمُسْلِمِيْنَ دِيْنُهُمْ وَلِلْيَهُوْدِ دِيْنُهُمْ"

ترجمہ: مسلمانوں کے لئے مسلمانوں کا دین اور یہودیوں کے لئے یہودیوں کا دین ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلم ریاست میں رہنے والے اقلیتوں کے پرسنل لاء یعنی نکاح، طلاق، وصیت، ہبہ، نان ونفقہ، عدت اور وراثت وغیرہ کے احکامات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی، بلکہ انھیں ان کے مذہب واعتقاد کے مطابق جو احکام واعمال جائز ہیں، انھیں ان پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہوگی۔

بنیادی سائنسی علوم میں رجحان کی کمی

تجزیہ، اسباب اور بحالی کی حکمتِ عملی

ڈاکٹر عامر عباس

حالیہ برسوں میں بنیادی سائنسی مضامین خصوصاً ریاضی، طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیوانیات میں طلبہ کے داخلوں میں نمایاں کمی دیکھی گئی ہے۔ یہ رجحان جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے تشویش کا باعث ہے کیونکہ یہی مضامین سائنسی تحقیق، تکنیکی ترقی، زراعت، ماحولیاتی نظم ونسق، صحت عامہ اور تعلیم کی بنیادی فکری اساس فراہم کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ صرف ایک تعلیمی مسئلہ نہیں بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طلبہ اور والدین کے نزدیک اعلیٰ تعلیم اور روزگار کے مواقع کے بارے میں سوچ میں ایک وسیع سماجی، معاشی اور ادارہ جاتی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ پاکستان سمیت کئی ترقی پذیر ممالک میں طلبہ اب زیادہ تر کمپیوٹر سائنس، مصنوعی ذہانت، انجینئرنگ، بزنس، فارمیسی اور دیگر پیشہ ورانہ و مارکیٹ سے منسلک شعبوں کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ بنیادی سائنسی علوم کو اکثر مشکل، روایتی اور روزگار کے اعتبار سے کم فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔

اس کمی کی ایک بڑی وجہ بنیادی سائنسی علوم کی ڈگریوں سے وابستہ روزگار کے محدود تصور کا پایا جانا ہے۔ طلبہ اور والدین عموماً کسی بھی تعلیمی پروگرام کا جائزہ ملازمت کے امکانات، تنخواہ، اور پیشہ ورانہ استحکام کی بنیاد پر لیتے ہیں۔ اس تناظر میں ریاضی، طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیوانیات کو اکثر ایسے مضامین سمجھا جاتا ہے جو زیادہ تر تدریس یا محدود تعلیمی و تحقیقی مواقع تک لے جاتے ہیں، جبکہ دیگر شعبے نسبتاً براہِ راست روزگار فراہم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ''کیریئر پر مبنی'' پروگراموں کی طرف رجحان بڑھا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بنیادی سائنسی علوم کا تعلق جدید شعبوں مثلاً ڈیٹا سائنس، بایوٹیکنالوجی، فارماسیوٹیکل صنعت، ماحولیاتی تجزیہ، زراعت، صنعتی تحقیق اور سائنسی جدت سے گہرا ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ ان مضامین کی مارکیٹ ویلیو نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان کی جدید دور میں افادیت اور پیشہ ورانہ اہمیت کو مناسب انداز میں پیش نہیں کیا جاتا۔

ایک اور اہم سبب ان مضامین کی مشکل نوعیت ہے، خاص طور پر ریاضی، طبیعیات اور کیمیا کی۔ اسکول اور کالج کی سطح پر کمزور تدریس، امتحانی دباؤ، اور رٹّے پر مبنی نظامِ تعلیم کی وجہ سے بہت سے طلبہ ان مضامین سے خوف محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تعلیمی نظام طلبہ میں تجزیاتی سوچ، سائنسی تجسس

اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے بجائے اکثر محض یادداشت پر زور دیتا ہے۔ نتیجتاً طلبہ یونیورسٹی میں داخلے کے وقت الجبرا، کیلکولس، سائنسی استدلال، تجربہ گاہی مہارت اور مسئلہ حل کرنے کی بنیادی صلاحیتوں میں کمزور ہوتے ہیں۔ جب ان کے سامنے ایک مشکل ڈگری اور غیر یقینی پیشہ ورانہ مستقبل ہو تو وہ فطری طور پر ایسے مضامین سے گریز کرتے ہیں۔ نباتیات اور حیوانیات کا مسئلہ کچھ مختلف ہے؛ انہیں اکثر روایتی اور صرف تشریحی مضامین سمجھا جاتا ہے جن کا جدید سائنسی یا صنعتی دنیا سے تعلق واضح نہیں کیا جاتا۔ طلبہ نباتیات کو صرف پودوں کی درجہ بندی اور حیوانیات کو صرف جانوروں کی درجہ بندی تک محدود سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت میں ان کا تعلق پلانٹ بایوٹیکنالوجی، ماحولیات، حیاتیاتی تنوع، ماہی پروری، صحت عامہ اور ماحولیاتی نظم و نسق سے بھی ہے۔

داخلوں میں کمی کی ایک اہم وجہ جامعات کے نصاب اور تدریسی طریقوں کا فرسودہ ہونا بھی ہے۔ بہت سے اداروں میں بنیادی سائنس کے پروگرام اب بھی حد سے زیادہ نظری نوعیت کے ہیں اور ان میں عملی اطلاق، بین الشعبہ جاتی مطالعہ، ڈیجیٹل مہارتوں اور مارکیٹ سے متعلق صلاحیتوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔ طلبہ ریاضی کے مجرد نظریات، طبیعیات کے کلاسیکی تصورات، کیمیا کے تعاملات و ساخت، نباتیات کی ساختیات یا حیوانیات کی درجہ بندی تو پڑھتے ہیں، لیکن انہیں یہ واضح نہیں کیا جاتا کہ یہی علوم ڈیٹا تجزیہ، کمپیوٹیشنل ٹولز، صنعتی کیمیا، فارماسیوٹیکل پیداوار، بایوٹیکنالوجی، موسمیاتی تبدیلی کے مسائل اور حقیقی دنیا کے سائنسی حل سے کس طرح جڑے ہوئے ہیں۔ نتیجتاً طلبہ اکثر اپنی تعلیم کا عملی مقصد سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ امتحانی نظام بھی عموماً تعریفیں، مشتقات اور درسی مواد یاد کرنے کو ترجیح دیتا ہے، جبکہ تحقیقی منصوبوں، تنقیدی تجزیے، سائنسی تحریر، فیلڈ ورک اور تجربہ گاہی مہارت کو مناسب اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس سے نہ صرف طلبہ کی دلچسپی کم ہوتی ہے بلکہ ان کی پیشہ ورانہ تیاری بھی متاثر ہوتی ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور اہم پہلو جامعات اور لیبر مارکیٹ کے درمیان کمزور تعلق ہے۔ بنیادی سائنس کے شعبہ جات اکثر صنعت، سرکاری اداروں، تحقیقی مراکز اور اطلاقی سائنسی میدانوں سے الگ تھلگ کام کرتے ہیں۔ ان شعبوں میں انٹرن شپس، مشترکہ منصوبوں، صنعتی تربیت اور کیریئر کونسلنگ کے مواقع کم ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے طلبہ یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ان کی تعلیمی تربیت عملی دنیا میں کس طرح استعمال ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ریاضی کے طلبہ ڈیٹا اینالیٹکس، ایکچوریل سائنس، مقداری مالیات اور مصنوعی ذہانت میں کردار ادا کر سکتے ہیں؛ طبیعیات کے طلبہ انسٹرومنٹیشن، توانائی، میڈیکل فزکس، جیو فزکس اور کمپیوٹیشنل ماڈلنگ میں کام کر سکتے ہیں؛ کیمیا کے طلبہ فارماسیوٹیکل صنعت، کوالٹی کنٹرول، فوڈ انڈسٹری، ماحولیاتی ٹیسٹنگ، فرانزک لیبارٹریز اور کیمیکل مینوفیکچرنگ میں خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اسی طرح نباتیات اور حیوانیات زراعت، جنگلات، ماہی پروری، بیماریوں کی ماحولیات، تحفظِ ماحول اور حیاتیاتی تنوع کے شعبوں میں نہایت اہم ہیں۔ لیکن چونکہ ان مواقع کو نصاب اور تعلیمی منصوبہ بندی میں نمایاں طور پر شامل نہیں کیا جاتا، اس لیے طلبہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان مضامین کا دائرۂ کار محدود ہے۔

معاشی حالات بھی اس بحران کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ بے روزگاری، مہنگائی اور مالی عدم تحفظ کے ماحول میں طلبہ اور ان کے خاندان زیادہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسی ڈگری میں سرمایہ کاری سے ہچکچاتے ہیں جس کا معاشی فائدہ غیر یقینی یا تاخیر سے حاصل ہو۔ اس صورت میں ''اس مضمون کا اسکوپ کیا ہے؟'' سب سے اہم سوال بن جاتا ہے۔ چونکہ بنیادی علوم، طب، انجینئرنگ یا کمپیوٹر سائنس کی طرح فوری اور واضح پیشہ ورانہ شناخت پیش نہیں کرتے، اس لیے ان کی کشش کم ہو جاتی ہے، چاہے ان کی طویل المدتی علمی اور معاشی اہمیت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ سماجی وقار بھی اس رجحان میں اہم کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ بہت سے خاندان ڈگری کا انتخاب صرف دلچسپی یا صلاحیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ سماجی حیثیت، شناخت، ملازمت کے استحکام اور بیرونِ ملک مواقع کے تناظر میں کرتے ہیں۔

اس کمی کے اثرات نہ صرف جامعات بلکہ پورے ملک کے لیے سنگین ہیں۔ اگر ریاضی، طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیوانیات میں طلبہ کی تعداد کم ہوتی رہی تو مستقبل میں سائنس اساتذہ، محققین، لیبارٹری ماہرین، ماحولیاتی ماہرین اور تکنیکی ماہرین کی فراہمی بھی کم ہو جائے گی۔ اس سے ملک کی سائنسی تحقیق، اختراع، تکنیکی ترقی، زرعی جدیدکاری، صنعتی ترقی، حیاتیاتی تنوع کے تحفظ اور شواہد پر مبنی پالیسی سازی کی صلاحیت کمزور ہو گی۔ ریاضی شماریات، ڈیٹا سائنس، مصنوعی ذہانت اور مقداری تحقیق کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی

ہے۔ طبیعیات توانائی، الیکٹرانکس، آلات سازی اور مٹیریلز سائنس کی بنیاد ہے۔ کیمیا فارماسیوٹیکل، صنعتی کیمیا، ماحولیاتی تجزیہ، فوڈ سائنس اور لیبارٹری پر مبنی اختراع میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ نباتیات زراعت، پودوں کی افزائش، جنگلات اور ماحولیاتی بحالی کے لیے ضروری ہے، جبکہ حیوانیات ماہی پروری، جنگلی حیات، پیراسائٹولوجی، بیماریوں کی ماحولیات اور حیاتیاتی تنوع کے تحفظ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جو ملک اپنے بنیادی علوم کو نظر انداز کرتا ہے، وہ دراصل اپنی اطلاقی سائنسز کی بنیاد کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔

ان مضامین میں داخلوں کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ جامعات بنیادی علوم کے پروگراموں کی شناخت کو جدید تقاضوں کے مطابق از سرِنو متعین کریں۔ ریاضی کو صرف ایک نظری مضمون یا تدریس تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے ڈیٹا سائنس، مالیاتی ریاضی، مشین لرننگ اور کمپیوٹیشنل ماڈلنگ سے جوڑا جائے۔ طبیعیات کو توانائی، آلات سازی، سمولیشن، آپٹکس، مٹیریلز اور طبّی اطلاقات سے مربوط کیا جائے۔ کیمیا کو واضح طور پر فارماسیوٹیکل سائنس، تجزیاتی کیمیا، صنعتی پیداوار، ماحولیاتی کیمیا، فرانزک سائنس اور فوڈ ٹیکنالوجی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ نباتیات کو پلانٹ سائنس، بایوٹیکنالوجی، فصلی جدت، ادویاتی پودوں اور ماحولیاتی پائیداری کے تناظر میں پڑھایا جائے، جبکہ حیوانیات کو جنگلی حیات، ماہی پروری، ماحولیات، بیماریوں کے کنٹرول اور حیاتیاتی تنوع کے انتظام سے جوڑا جائے۔ اس نئی شناخت کے ،ساتھ نصاب میں حقیقی اصلاح بھی ضروری ہے، جس میں پائتھن، شماریات بایوانفارمیٹکس، سائنسی تحریر، تجربہ گاہی مہارت اور منصوبہ جاتی ،GIS تعلیم شامل ہو۔

اسی طرح واضح کیریئر راستے اور مارکیٹ سے مضبوط روابط قائم کرنا بھی ناگزیر ہے۔ شعبہ جات کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو اپنے مضامین سے متعلق ملازمتوں، اداروں، انٹرن شپس، وظائف اور اعلیٰ تعلیم کے امکانات کے بارے میں واضح رہنمائی فراہم کریں۔ جامعات کو اسکولوں، تحقیقی اداروں، ہسپتالوں، فارماسیوٹیکل صنعتوں، زرعی تنظیموں، بیج کمپنیوں، ماحولیاتی اداروں، ماہی پروری کے محکموں اور ڈیٹا پر مبنی صنعتوں کے ساتھ شراکت داری قائم کرنی چاہیے تاکہ طلبہ عملی تجربہ حاصل کر سکیں اور اپنی تعلیم کی حقیقی افادیت کو سمجھ سکیں۔ انٹرن شپس، فیلڈ پلیسمنٹ اور کیپسٹون پراجیکٹس کو سائنس ڈگریوں کا باقاعدہ حصہ بنایا جانا چاہیے، جبکہ مختلف شعبوں میں کام کرنے والے سابق طلبہ کو مدعو کر کے یہ دکھایا جانا چاہیے کہ بنیادی سائنسی علوم تدریس کے علاوہ بھی باوقار اور کامیاب کیریئر فراہم کر سکتے ہیں۔

اور حکومتی اداروں کو بھی بنیادی علوم کی بحالی HEC پالیسی کی سطح پر میں فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ ان مضامین کو قومی ترقی کے لیے اسٹریٹجک اہمیت کے حامل شعبے سمجھا جانا چاہیے، نہ کہ صرف مارکیٹ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ وظائف، لیبارٹری فنڈنگ، تحقیقی گرانٹس اور فیکلٹی ڈویلپمنٹ پروگرامز خاص طور پر بنیادی سائنس کے شعبہ جات کے لیے مختص کیے جانے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ اور والدین کو ان مضامین کی جدید اہمیت سے آگاہ کرنے کے لیے کیریئر آگاہی مہمات چلائی جائیں۔ مزید برآں، اسکول اور کالج کی سطح پر سائنس کی تعلیم کو بھی بہتر بنانا ہوگا تاکہ طلبہ یونیورسٹی میں بہتر فکری بنیاد، عملی اعتماد اور حقیقی سائنسی دلچسپی کے ساتھ داخل ہوں۔ اگر ابتدائی سطح پر سائنس کی تدریس بہتر نہ ہوئی تو جامعات کو بدستور ایسے طلبہ ملتے رہیں گے جو بنیادی علوم کے لیے نہ پوری طرح تیار ہوں گے اور نہ ہی ان میں دلچسپی رکھتے ہوں گے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاضی، طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیوانیات میں داخلوں میں کمی ایک کثیرالجہتی مسئلہ ہے، جس کی جڑیں کمزور کیریئر آگاہی، فرسودہ نصاب، کمزور تعلیمی بنیاد، معاشی غیر یقینی صورتحال، اور جامعات کے مارکیٹ سے ناکافی تعلق میں پیوست ہیں۔ تاہم، اس کمی کو ان مضامین کی غیر اہمیت کا ثبوت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کے برعکس، یہ مضامین سائنسی ترقی، تکنیکی جدت، صنعتی نمو، ماحولیاتی پائیداری، زراعت، صحت اور قومی تحقیقی صلاحیت کے لیے ناگزیر ہیں۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ان علوم کو جدید معاشرتی اور معاشی تقاضوں کے ساتھ دوبارہ مربوط کیا جائے۔ اگر نصاب میں اصلاح، عملی مہارتوں کا انضمام، صنعت و حکومت کے ساتھ شراکت، مؤثر کیریئر رہنمائی، اور ان مضامین کی سماجی و قومی اہمیت کے اعتراف پر سنجیدگی سے کام کیا جائے، تو بنیادی سائنسی علوم دوبارہ اپنی علمی وقعت اور مارکیٹ میں اعتماد حاصل کر سکتے ہیں اور ایک بار پھر باصلاحیت طلبہ کے لیے پرکشش انتخاب بن سکتے ہیں۔

سفر سویک لیک، ایک ناقابلِ فراموش داستان

ماہ رخ فضل، شعبہ مینجمنٹ سائنسز

آخر کار، ہمارا وہ بے حد انتظار کیا جانے والا دن آ ہی گیا۔ 24 مئی کی صبح! فجر کی اذان کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی تھی، حالانکہ میں ساری رات ٹھیک سے سو بھی نہیں پائی تھی۔ صبح 6 بجے کا وقت مقرر تھا اور ہر کوئی اپنے اپنے گھروں سے بہت پیارا اور تیار ہو کر نکل رہا تھا۔ ہر لڑکی نے اپنا بہترین لباس پہنا ہوا تھا، ہلکا سا میک اپ تھا، اور چہرے پر وہ مسکراہٹ تھی جو کسی عام دن دیکھنے کو نہیں ملتی۔ میں جب یونیورسٹی کے مین کیمپس پہنچی تو وہاں کا منظر ہی الگ تھا۔ سب دوست اکٹھے تھے اور ایک دوسرے کے کپڑوں کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ انتظار کرنا سب سے مشکل کام لگ رہا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گھڑی کی سوئیاں رک سی گئی ہوں۔ جیسے ہی سب اسٹوڈنٹس وہاں پہنچے، دو بڑی اور آرام دہ بسیں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ہم سب جلدی جلدی ان بسوں میں سوار ہو گئے۔ لڑکیوں نے اپنی پسند کی نشستیں سنبھال لیں، جہاں سے باہر کا منظر اچھی طرح دیکھا جا سکتا تھا۔ سفر شروع ہوتے ہی بسوں میں میوزک آن کر دیا گیا، اور وہاں سے ہمارے سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سفر کے شروع ہوتے ہی ہم نے قدرت کا ایک بہت بڑا کرشمہ دیکھا! اور وہ کرشمہ کیا تھا؟ ہمارے یاسر صاحب، جو ہمیشہ سخت مزاج اور سنجیدہ رہتے تھے، آج وہ مسکرا رہے تھے اور ہنس رہے تھے! یہ منظر ہمارے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ ہم سب دوستوں نے ایک دوسرے کو اشاروں میں دکھایا اور خوب انجوائے کیا کہ چلو، ٹور کی وجہ سے اساتذہ بھی ہمارے ساتھ ریلیکس موڈ میں ہیں۔ ہمارا سفر باباگورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کے مین کیمپس سے شروع ہوا۔ مانانوالہ کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہم فاروق آباد شہر پہنچے، اور وہاں سے ہم نے موٹروے کا راستہ اختیار کیا۔ موٹروے پر گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہماری مستیوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ بس میں تیز میوزک چل رہا تھا اور لڑکوں نے اپنی اداکاری شروع کر دی تھی۔ پتہ نہیں اس دن ان لڑکوں میں کہاں سے کترینہ کیف کی روح آ گئی تھی! وہ ایسی عجیب اور مزاحیہ حرکتیں کر رہے تھے کہ ہم لڑکیاں ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھیں۔ سفر اتنا تفریح سے بھرپور تھا کہ راستے اور وقت کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ چلیے، اب دھوپ کی بات کرتے ہیں۔ مئی کا مہینہ اور پاکستان کی گرمی! دھوپ نے شاید ہمارے ساتھ سفر کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ گرمی کی شدت بہت زیادہ تھی۔ جب ہم بھیرہ انٹرچینج پر رکے، جہاں تھوڑی دیر آرام کرنا تھا، تو باہر نکلتے ہی دھوپ نے ہمارا استقبال کیا۔ جو کمی اس پورے سفر میں محسوس ہو رہی تھی، وہ اس شدید گرمی کی تھی۔ ہمیں فکر ہونے لگی کہ کہیں ہمارا میک اپ نہ خراب ہو جائے اور گرمی سے برا حال نہ ہو۔ لیکن ہماری بے تابی اور جوش اتنا عروج پر تھا کہ ہم نے اس گرمی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ہم بس جلد از جلد اپنی منزل، یعنی وادیٔ سویک لیک پہنچنا چاہتے تھے۔ بھیرہ سے نکلنے کے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ اور پھر، کچھ ہی گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہم اپنی پہلی منزل پر پہنچ گئے۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا، دھوپ نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ ہی وادیٔ کھنڈوا پہنچ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سورج بالکل ہمارے سروں پر کھڑا ہے۔ لیکن وہاں پہاڑوں کی عظمت اور جگہ کی خوبصورتی نے ہمیں اپنی طرف اس قدر متوجہ کیا کہ ہم گرمی کی پروا کیے بغیر آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑا آگے گئے تو ہمیں وہاں بہت سی جیپیں کھڑی ملیں۔ اساتذہ نے بتایا کہ آگے کا راستہ بہت دشوار ہے اور بسیں وہاں نہیں جا سکتیں، اس لیے ہمارے لیے اوپن جیپیں بک کی گئی ہیں۔ ہم لڑکیاں یہ سن کر بہت خوش ہوئیں! واہ! اوپن جیپ میں پہاڑی سفر! کتنی اچھی تصاویر آئیں گی اور ہم کتنا انجوائے کریں گے! یہی ہماری سوچ تھی۔ ہم خوشی خوشی جیپوں میں بیٹھ گئے، یہ سوچتے ہوئے کہ آگے کا سفر بہت سکون اور مزے سے گزرے گا

قدرت کے دلکش نظارے اور لازوال یادیں—شعبہ مینجمنٹ کا سویک جھیل کا سفر

لیکن ہماری خوشی صرف چند لمحوں کی مہمان تھی۔ ہماری جیپ کا جو ڈرائیور پٹھان بھائی تھا، اُس نے جیپ چلانے سے پہلے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،"بیٹی بیٹھ تو گئی ہو، پر جب چلاؤں گا تو پھر بتانا! " اُس وقت ہمیں اُس کی بات کا مطلب سمجھ نہیں آیا۔ لیکن جیسے ہی جیپ سٹارٹ ہوئی اور اُن ٹیڑھی میڑھی، اکھڑی ہوئی، کچی پہاڑی سڑکوں پر چلنا شروع ہوئی۔" یا اللہ " ہماری چیخیں نکل گئیں۔ جیپ اس طرح اچھل رہی تھی جیسے ہوا میں اُڑ رہی ہو۔ ایک طرف اونچا پہاڑ اور دوسری طرف انتہائی گہری کھائیاں۔ ہم لڑکیوں نے سائیڈ کے ڈنڈوں کو اتنی زور سے پکڑا ہوا تھا کہ ہمارے ہاتھ سرخ ہو گئے تھے۔ ہمیں اُس وقت نہ پکچرز یاد آئیں، نہ وڈیوز بنانے کا شوق رہا۔ ہمیں تو یہ فکر پڑ گئی تھی کہ جنت کیسی ہو گی ؟ کیونکہ لگ رہا تھا کہ اگلے ہی پل ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ ہنسی کی جگہ ہماری زبانوں پر کلمہ جاری ہو گیا تھا۔ ڈر کے مارے کسی کی آنکھ بند تھی تو کوئی آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔

جب کچھ دیر کے اس خوفناک سفر کے بعد جیپ ایک کھلی جگہ پر جا کر رکی، تو جیسے ہماری جان میں جان آئی۔ ہم جلدی سے نیچے اترے، اپنے قدموں کو زمین پر رکھا اور زمین کو چوما۔ ہم نے اُس پٹھان بھائی کا شکریہ ادا کیا اور کہا، بھائی اس زندگی میں سویک لیک دیکھنا نصیب کروانے کا شکریہ آپ لوگ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ شکر ہے، سفر ختم ہوا اور ہم سویک لیک پہنچ گئے۔ لیکن نہیں! آپ کی بھی وہی بھول ہے جو ہماری تھی۔ اصل داستان تو اب شروع ہوئی تھی۔ جس جگہ جیپ نے ہمیں اتارا تھا، وہ دراصل ایک کوئلے کی کان (مائن) تھی۔ وہاں کا ماحول بہت الگ تھا۔ ہم وہاں اکیلے نہیں تھے، پچھلی جیپوں میں آنے والے دوستوں کا انتظار کرنا رہتا تھا۔ آدھا گھنٹہ ہم وہاں اُس تپتی دھوپ میں کھڑے رہے۔ لیکن لڑکیاں کہاں باز آنے والی تھیں؟ اُس شدید دھوپ میں بھی ہم نے اپنا کیمرہ آن کیا اور خوب تصویریں بنائیں اور اسٹیٹس لگاے۔

جب سب لوگ وہاں جمع ہو گئے، تو مقامی لوگوں اور وہاں آنے والے دوستوں نے ہمیں تسلی دی کہ،بس تھوڑا سا آگے ہی سویک لیک ہے، آپ لوگ پریشان نہ ہوں، ہم تو یہاں آتے رہتے ہیں۔ہم نے بھی اُن کی بات پر یقین کر لیا، حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ وہاں موجود کسی ایک شخص کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے پیدل کتنا چلنا ہے اور پھر ہم نے پیدل چلنا شروع کیا۔ ہم چلتے گئے، چلتے گئے، اور پھر مزید چلتے گئے۔ پہاڑی کا راستہ تھا، اوبڑ کھابڑ، ٹیڑھا میڑھا، پتھروں سے بھرا ہوا، دھوپ اپنی پوری شدت پر تھی، اور اوپر سے ہمارے پیٹ میں بھوک نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ اور اب یہاں ذکر آتا ہے ہماری اُس سب سے بڑی بے وقوفی کا۔ ہم لڑکیوں کو اس جگہ کی پتھرلی آب و ہوا کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ ہم نے تو اپنے ڈریسز کے ساتھ فلیٹ میچنگ فینسی شوز اور کچھ نے تو ہیل تک پہنی ہوئی تھیں جس جگہ ٹھیک ٹھاک جاگرز پہن کر چلنا محال تھا، وہاں ہم فیشن کے چکر میں پھنس گئے تھے۔ وہاں پر لڑکیوں کی جو الٹی بازیاں لگیں،اُس نے ہمارا برا حال کر دیا۔ کوئی لڑکی پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر رہی ہے، تو کسی کی پائل پتھر میں پھنس رہی ہے۔اتنی شدت کی تھکاوٹ، دھوپ، اور اوپر سے اس طرح پھسلنا! ہماری حالت قابلِ رحم ہو چکی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ صرف ہماری نہیں، لڑکوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی اس دشوار گزار راستے پر ہانپ رہے تھے۔ گرمی اور مسلسل چلنے کی وجہ سے ہمارا گلا بالکل خشک ہو چکا تھا۔ ہم اس پانی کی بوند بوند کو ترس گئے تھے جس کی ہم عام زندگی میں شاید ہی قدر کرتے ہیں۔ اُس وقت اگر ہمیں کوئی گندا پانی بھی دے دیتا تو ہم پی لیتے، لیکن وہاں جو پانی ملا، وہ کسی آبِ زمزم سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ وہاں پہاڑوں کے درمیان سے بہنے والے آبشاروں (واٹر فالز) کا بالکل صاف اور ٹھنڈا پانی تھا۔ ہم نے اپنی خالی واٹر منرل کی باٹلز اُن آبشاروں سے بھریں اور پانی پیا۔ وہ ایک بوند حلق سے اُترتے ہی جو آرام ملا، وہ ایک بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی۔ کچھ مزید آگے بڑھے تو اچانک ہمارے چہروں پر ایک انتہائی ٹھنڈی اور سکون آور ہوا کا جھونکا لگا۔ ہمیں فوراً اندازہ ہو گیا کہ جھیل اب بہت قریب ہے، کیونکہ ایسی ٹھنڈی ہوا پانی کے ذخیرے سے ہی آ سکتی تھی۔ حالانکہ جھیل ابھی تک دکھائی نہیں دے رہی تھی، لیکن اس ہوا نے ہمارے اندر ایک نئی جان ڈال دی۔

اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود تھی۔ سبحان اللہ! وہ منظر میرے لفظوں کی قید سے باہر ہے۔ جھیل کو دیکھتے ہی ہماری ساری تھکاوٹ، ساری شکایتیں اور پیروں کا درد ہوا میں اڑ گیا۔ ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہم تیز قدموں سے جھیل کے کنارے پہنچے۔ جیسے ہی میں نے اپنے تھکے ہوئے، گرم پاؤں جھیل کے اُس یخ ٹھنڈے پانی میں رکھے ... . اُف! اُس وقت مجھے بالکل ایسا لگا جیسے میں دنیا کے سب سے پر سکون مقام پر، شاید جنت میں کھڑی ہوں، لڑکوں نے تو آتے ہی پانی میں چھلانگیں لگا دیں اور نہا نہا کر خوب ہلہ گلہ شروع کر دیا۔ لیکن ہم لڑکیوں نے بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ پانی اتنا ٹھنڈا، ارد گرد کے پہاڑوں کا سبزہ، اور اوپر سے چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا! ہمارا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔ جھیل کا وہ منظر بالکل کسی بالی وڈ فلم کے سین جیسا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی خوبصورت جگہ اتنے قریب سے نہیں دیکھی تھی۔ ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے، پانی سے کھیلتے رہے، اور اُس حسین لمحے کو اپنے اندر جذب کرتے رہے۔ ہم تھوڑی دیر وہاں سکون لینے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ اچانک موسم نے پلٹی کھائی۔ ایسا لگا جیسے آسمان ہمیں کہہ رہا ہو کہ بچو، پریشان نہ ہو، میں تمہاری تھکاوٹ اپنی ہواؤں سے دور کرتا ہوں۔ اچانک بہت تیز آندھی شروع ہو گئی۔ ہم پہاڑوں کے بالکل اوپر کھڑے تھے، اس لیے ہوا کا دباؤ اور شدت اور بھی زیادہ تھی۔ موسم نے ایک دم سے اپنا رخ بدل لیا۔ گرد اور ہوا کے اس طوفان میں ہم مشکل سے اپنی آنکھیں کھول پا رہے تھے۔ ہم کسی نہ کسی طرح بھاگ کر واپس اُن جیپوں تک پہنچے۔ جیسے ہی ہم جیپوں میں بیٹھے، ہمیں نیچے کی گہری کھائیاں اور سامنے طوفان دونوں ایک ساتھ نظر آ رہے تھے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں، وہ میری زندگی کا سب سے خوفناک اور ناقابلِ فراموش وقت تھا۔ لیکن بات یہاں تک ختم نہیں ہوئی. جیسے ہی جیپوں نے واپس نیچے اترنا شروع کیا، آسمان سے زور دار بارش برسنا شروع ہو گئی! اب منظر کچھ یوں تھا: کھلی جیپ، چاروں طرف اندھیری گہری کھائیاں، تیز آندھی اور شدت کی بارش! جس کچی ٹیڑھی جگہ پر جیپ چل رہی تھی، اُس پر تو گاڑی ویسے ہی سلپ ہوتی ہے، اور بارش کے بعد تو کیچڑ نے اُسے اور خطرناک بنا دیا تھا میں دل سے اُن پٹھان بھائیوں کو سلام کرتی ہوں جو جیپیں چلا رہے تھے۔ اُنھوں نے اتنی احتیاط، مہارت اور ٹھنڈے دماغ سے جیپیں

چلائیں کہ اگر تھوڑی سی بھی غلطی ہوتی تو ہم کسی گہری کھائی میں گرے ہوتے۔ ہمارا دل حقیقت میں ہماری مٹھی میں تھا۔ ہم سب لڑکیاں سانس روکے بس دعائیں پڑھ رہی تھیں کہ یا اللہ بس خیریت سے نیچے بس تک پہنچا دے۔ بارش نے ہمیں مکمل طور پر بھگو دیا تھا بہت مشکلوں اور دل کی دھڑکنوں کی تیزی کے بعد، ہم آخر کار نیچے پہنچ گئے جہاں ہماری بسز تھیں۔ ہم پوری طرح بارش میں نہا چکے تھے۔ لیکن یہ خوف، یہ بارش اور جیپوں کا وہ سفر ہماری زندگی کی ایک ایسی میموری بن گیا ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہم نہا کر، گیلے کپڑوں کے ساتھ ہی بس میں بیٹھ گئے۔ ٹیچرز اور ہم سب کا برا حال تھا، مگر چہروں پر ایک سیٹسفیکیشن تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بس کی ونڈوز سے اندر آ رہی تھی اور باہر کی بارش میں دھلے ہوئے پہاڑ انتہائی حسین لگ رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ٹور شاید اب ختم ہو رہا ہے، لیکن ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ سفر کا اصل مزہ تو اب شروع ہونے والا تھا۔ بس کچھ دیر بعد ایک ایسی جگہ جا کر رکی جو پورے ٹور کی بہترین اور حسین ترین میموری بن گئی۔ صبح سے بھوکے پیاسے، اتنی مشقت کے بعد ہمارے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ جیسے ہی ہم اُس جگہ پہنچے ہمیں کھانے کی جگہ نظر آئی اور ہماری امید کی کرن پھوٹ پڑی۔ وہاں پر کھانے کا بہترین انتظام تھا۔ زورو شور سے بارش ہو رہی تھی، پہاڑوں کے درمیان کھلا آسمان، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، اور اُس موسم میں گرما گرم لذیذ کھانا! اُف، ہم اپنی ساری تھکاوٹ اور پریشانیاں بھول گئے۔ ہم نے وہاں دل کھول کر، دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم وہاں بنے ہوئے پارک میں نکلے، جہاں ہم نے جھولے لیے۔ اُس کے بعد ہم لاوا لیک کے پاس گئے۔ لاوا لیک کا وہ منظر میں شاید کبھی الفاظ میں پوری طرح بیان نہ کر سکوں۔ وہ میری زندگی کا سب سے خوبصورت اور دلکش ترین منظر تھا۔ تیز چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا، لیک کے پانی میں بننے والا بلیو شیڈ اور اس کے پیچھے ڈھلتا ہوا سورج ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی پینٹر نے اپنے بہترین رنگوں سے یہ کینوس تیار کیا ہو۔ ہم نے وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر خوب ساری پکچرز بنائیں، اُن حسین لمحات کو اپنے کیمراز اور دلوں میں محفوظ کیا۔ وہاں ہماری ایکٹویٹیز صرف پکچرز تک محدود نہیں تھیں۔ ہم نے ٹیچرز کے ساتھ آفیشل ہوتا ہے، لیکن اس ٹور نے ہمارے درمیان ایک بہت پیارا اور فرنڈلی بانڈ بنا دیا تھا۔ ہم نے اُن کے ساتھ مل کر بہت خوبصورت یادیں بنائیں۔ شام ڈھل رہی تھی اور واپسی کا وقت قریب آرہا تھا۔ ٹیچرز نے ہمیں بس کی طرف واپس آنے کے لیے بلانا شروع کر دیا۔ جیسے ہی ہم بس میں واپس بیٹھے، دل میں دو طرح کی فیلنگز تھیں۔ ایک طرف بہت زیادہ خوشی تھی کہ ہم نے اتنا حسین وقت گزارا اور دوسری طرف ایک اداسی تھی کہ یہ خوبصورت دن اتنی جلدی ختم ہو گیا۔ بسز دوبارہ موٹروے کی طرف گامزن ہوئیں۔ بارش اور ہوا کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا اور پہاڑوں کی یادیں ہمارے دلوں میں تازہ تھیں۔ بس میں بالکل ہلکا ہلکا اور سکون آور میوزک چل رہا تھا اور ہم سب ساتھ ساتھ گنگنا رہے تھے۔ ایک عجیب سا پیس آف مائنڈ تھا اُس وقت۔ سفر کرتے ہوئے ہم واپس بھیرہ انٹرچینج پر رکے۔ اس دفعہ رات کا وقت تھا اور ہم ہارڈیز فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ پر رکے۔ وہاں ہمارے لیے ایک دفعہ پھر کھانے کا انتظام تھا، ہم نے وہاں پر بہترین برگرز اور فرائز کا لطف اٹھایا۔ لیکن اس سٹاپ کی اصل کہانی کچھ اور ہی تھی ہارڈیز کے کھانے کے ساتھ کولڈ ڈرنکس پر ایک اسپیشل آفر چل رہی تھی ''ان لیمیٹڈ کولڈ ڈرنکس ری فل۔'' پہلے تو ریسٹورنٹ کا ماحول بالکل نارمل تھا لیکن جیسے ہی ہماری کلاس کے لڑکوں کا گروپ وہاں اینٹر ہوا، ایسا لگا جیسے ریسٹورنٹ میں کوئی چھوٹا سا زلزلہ آ گیا ہو! ہمیں سمجھ آ گئی کہ یہ کوئی زلزلہ نہیں، بلکہ بابا گرونانک یونیورسٹی کے شاہین ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے ہیں اُنھوں نے جب ان لیمیٹڈ کولڈ ڈرنکس ری فل پڑھا تو جیسے اُن کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ اُنھوں نے وہاں ایسی تباہی مچائی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ ہمارے لڑکوں نے ایک ایک کر کے کئی دفعہ اپنے گلاسز ری فل کروائے۔ ایک موقعہ تو ایسا آیا کہ بیچارے ہارڈیز کے سٹاف نے ہاتھ جوڑ دیے! ان بیچارے ویٹرز نے ہمارے ٹیچرز کے پاس آکر ہاتھ جوڑ کر کمپلین کی کہ سر مہربانی کر کے اپنے ان شاہینوں کو یہاں سے لے جائیں، ہم ان کے گلاسز مزید ری فل نہیں کر سکتے یہ دیکھ کر ہم لڑکیوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے ٹور کی سب سے مزاحیہ میموری بن گیا۔ ہمارے ٹیچرز نے بھی اس سیچوایشن کو بہت اچھے اور کامیڈی انداز میں ہینڈل کیا۔ ہارڈیز سے نکلنے کے بعد ہم دوبارہ بس میں سوار ہوئے اور اپنی منزل یعنی

ننکانہ صاحب کی طرف روانہ ہوئے۔ واپسی کے سفر پر موسم واقعی کمال کا تھا۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں، بارش ہو رہی تھی، اور باہر گھپ اندھیری رات تھی۔ بس کے اندر ایک دوسرے کے کندھوں پر سر رکھ کر سوتے ہوئے لوگ تھے۔ تھکاوٹ تو ہمارے جسموں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، لیکن دل اتنے پر سکون تھے کہ تھکاوٹ کا احساس بھی میٹھا لگ رہا تھا۔ ہم نے اس ٹرپ کا ہر لمحہ، ہر دشواری، ہر مسکراہٹ اور ہر بارش کے قطرے کو دل سے انجوائے کیا۔ جب ہم ننکانہ صاحب واپس پہنچے تو رات کافی گزر چکی تھی ۔ ہم اپنے اپنے گھروں کی طرف تو چلے گئے، لیکن وہ دن، وہ 24 مئی 2025 کی تاریخ ہماری زندگیوں میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی۔

جوتے (افسانہ)

محمد جمیل اختر

میرے جوتے گم ہو گئے ہیں، آپ کو ملیں تو مجھے لوٹا دیجیے گا۔

لڑکے نے پریشانی میں ایک دکاندار سے کہا کہاں گم ہوئے ہیں ؟ آدمی نے پوچھا۔

یہ ابھی یہاں اِدھر ہی آپ کی دُکان کے باہر اتارے تھے، کسی نے کہا کہ سامنے گلی میں مفت راشن تقسیم ہو رہا ہے سو میں جوتے یہاں اُتار کر بھاگ گیا تھا۔

جوتوں سمیت چلے جاتے تو جلدی پہنچتے۔

نہیں میرے جوتے مجھے بھاگنے میں مدد نہیں دیتے ، وہ تھوڑے سے بڑے ہیں ، پاؤں باہر نکل آتے ہیں۔

دراصل وہ میرے بھائی کے تھے ، اُن پر اب چھوٹے ہو گئے ہیں سو اب میرے ہیں۔

تو پرانے جوتے تھے سو تمہیں کیا پریشانی ہے۔

وہ جوتے بہت خاص ہیں ، نواب صاحب کے بیٹے نے استعمال کے بعد ہمیں دیے تھے۔

تمہیں راشن ملا ؟

نہیں وہ کسی نے جھوٹ میں آواز لگائی تھی، شاید وہ میرے جوتے چرانا چاہتا تھا۔

اتنے پرانے جوتے کوئی نہیں چراتا۔

وہ اتنے پرانے نہیں تھے ، وہ بہت قیمتی تھے نواب صاحب کے بیٹے کبھی بھی کوئی عام چیز نہیں پہنتے۔

صفائی والا یہاں سے گزرا تھا ہو سکتا ہے اُس نے جوتوں کو اپنے کوڑا کرکٹ جمع کرنے والے تھیلے میں ڈال لیا ہو ، وہ یہاں سے جنوبی گلی میں گیا ہے۔

کیا، آہ میرے قیمتی جوتے ، میں ابھی اس کے پیچھے جاتا ہوں۔

رکو، لڑکے تمہارے پاؤں سے خون بہہ رہا ہے دکاندار نے اونچی آواز میں لڑکے کو پکارا۔ پاؤں کی خیر ہے ۔۔۔ لڑکے نے کہا اور جنوبی سمت میں جاتی گلی میں بھاگتے ہوئے گم ہو گیا۔

دیو اور دیوانہ

ترجمہ: سلیم اختر ڈھیرہ

یہ ایک اطالوی لوک کہانی ہے، جس کا اردو میں ترجمہ اردو قارئین کو اطالوی ثقافت و معاشرت سے روشناس کرانے کے مقصد سے کیا گیا ہے۔

روم میں دیوانہ نامی ایک لکڑ ہارا رہتا تھا۔ ایک دفعہ شاہ بلوط کے درخت سے لکڑیاں کاٹتے ہوئے ایک بڑی سی شاخ اس پر آ گری اور اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اسے تین ماہ کے لیے ہسپتال رہنا پڑا۔ مگر وہ ہسپتال میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ وہاں سے بھاگ گیا اور ایک گاؤں کی خالی جھونپڑی میں رہنے لگا۔ جونہی اس نے پنڈلی سے پٹی ہٹائی تو مکھیوں کا ایک جھرمٹ زخم کے ارد گرد بھن بھن کرنے لگا۔ دیوانہ اٹھا اور انھیں ایک ایک کر کے ہتھیلی کی مدد سے مارنے لگا۔ جب کوئی بھی باقی نہ بچی تو وہ فرش پر پڑی مردہ مکھیوں کو گننے لگا کہ اس نے کتنی مکھیاں ماری ہیں۔ پانچ سو۔ دیوانے کا سینہ فخر سے پھول گیا اور اس نے ایک چھوٹی تختی بنوائی جس پر اس نے لکھوایا

دیوانہ ہے میرا نام
کرتا ہوں بڑے بڑے کام
بہادری کی تم میری داد دو
مرے ہیں میرے ہاتھوں پانچ سو

اس تختی کو گلے میں ٹکائے دیوانہ گلیوں بازاروں میں گھومنے لگا۔ اگلے دن بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔

چونکہ تم اس دنیا کے سب سے بہادر آدمی ہو۔ تم پہاڑ پر چڑھ کر دیو کو کیوں نہیں مارتے جو ہمارے ہزاروں لوگوں کو کھا چکا ہے۔ چنانچہ دیوانہ جنگل میں جا لگا۔ جب وہ پہاڑ کی جانب بڑھ رہا تھا تو اس نے ایک گڈریا دیکھا۔ "دیو کی غار کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔ "تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو۔" گڈریے نے سوال کیا۔ "وہ تمھیں ایک ہی نوالے میں کھا ڈالے گا۔" دیوانہ بولا: "آپ مجھے تین چار پیڑے پنیر کے دے دیں میں آپ کو ان کی قیمت ادا کر دوں گا۔" پھر وہ پیڑوں کو اٹھائے آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دیو کی غار کے قریب پہنچا تو دیوانے نے شور کرنے کی غرض سے فرش پر زور زور سے پاؤں مارنا شروع کر دیے۔ شور سن کر دیو غار سے دھاڑتا چنگھاڑتا باہر آ گیا۔ "کون ہے یہ گستاخ!" اس نے پوچھا۔

دیوانے نے پنیر کا ایک پیڑا دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور دیو سے کہا: "اب تم خاموش رہو ورنہ میں اس پتھر کی طرح تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" اور جیسے ہی اس نے پیڑے کو بھینچا، تو پنیر مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر اس کے انگلیوں میں سے نکلتا ہوا سارے فرش پر گر گیا۔

یہ سب دیکھ کر دیو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "ایسے طاقت ور شخص سے دشمنی کھلکھا مول لینا ٹھیک نہیں۔" دیو نے سوچا۔ "بہتر یہ ہے کہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے۔" دیو نے دیوانے سے پوچھا کہ کیا وہ اس کے ساتھ رہنا پسند کرے گا۔ دیوانے نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے باقی پیڑے دور پھینک دیے اور دیو کے ساتھ غار میں چلا گیا۔

اگلی صبح دیو نے ایک رسی لی اور لکڑیوں کے لیے جنگل میں چلا گیا۔ دیوانہ بھی دیو کے ساتھ ہی چلا گیا۔ دیو نے رسی شاہ بلوط کے دو درختوں کے تنوں کے ساتھ باندھی اور اُن کو جڑوں سمیت کسی مولی گاجر کی طرح زمین سے اکھاڑ دیا۔ پھر اس نے دیوانے سے کہا: "لواب تم آؤ اور ایک درخت تم اکھاڑو۔"

"یقیناً" دیوانہ بولا۔ "مگر مجھے اس سے کئی گنا زیادہ لمبی رسی چاہیے۔ میں ایک ہی وقت میں پورے جنگل کے درخت اکھاڑ دوں گا تاکہ ہمیں بار بار لکڑیاں لینے آنا نہ پڑے۔" "تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" دیو بولا "تم درختوں کی نسل ہی ختم کرنا چاہتے ہو۔ ہمارے پاس پہلے ہی کافی لکڑیاں موجود ہیں۔ تم رہنے دو ۔ اتنی عجلت میں جنگل کا خاتمہ ٹھیک نہیں"۔

ایک دن دیو نے دیوانے کے ساتھ یہ دیکھنے کے لیے شرط لگائی کہ کون زیادہ دور پتھر پھینک سکتا ہے۔ "جو جیت جائے گا اسے ایک سو اشرفیوں کا انعام ملے گا۔" پھینکنے کے لیے آٹے کی چکی سے چکی کا ایک پاٹ ادھار مانگا گیا۔ پہلی باری دیو کی تھی۔ دیو نے چکی کا پاٹ پھینکا اور وہ ایک میل دور جا گرا۔ جہاں پتھر گرا تھا وہاں دیو نے نشان لگایا اور چکی کا پاٹ واپس لا کر دیوانے سے کہنے لگا: "اب تمہاری باری"۔

دیوانے نے چکی کے پاٹ کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ اتنے بھاری پتھر کو تو وہ ذرا برابر بھی سرکا نہیں سکتا۔ وہ تھوڑا آگے جھکا اور تھوڑے فاصلے پر نگاہیں گاڑے کہنے لگا۔ "اجی! یہاں سے ہٹ جاؤ، ہوشیار۔" دیو نے کنکھیوں سے دیکھا اور کہنے لگا: "تم کس پر چلا رہے ہو۔ مجھے تو وہاں کچھ نظر نہیں آرہا"۔ دیوانہ بولا: "میں تو دور ساحل سمندر پر لوگوں کو جگہ خالی کرنے کا بول رہا ہوں۔" "اگر ایسی بات ہے تو پھر تم رہنے دو۔ اگر یہ پاٹ اتنی دور جا گرے گا تو پھر ہم اسے کبھی ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔" چنانچہ دیو نے ہار مان لی اور شرط کے پیسے دیوانے کے حوالے کر دیے۔

کئی دنوں بعد دیوانے نے خود تجویز پیش کی کہ انھیں اپنی اپنی طاقت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ "ہم یہ دیکھیں گے کہ کون شاہ بلوط کے تنے میں کتنی گہری انگلیاں گاڑ سکتا ہے"۔

"بہت خوب" دیو بولا۔ "میں سو اشرفیوں کی شرط لگاتا ہوں"۔

دیوانہ چپکے چپکے شاہ بلوط کے پاس گیا اور اس کے تنے میں چھری کی مدد سے سوراخ کیا اور پھر اس سوراخ کو لکڑی کے برادے سے بھر دیا اور سوراخ کے منہ پر اس طرز کے درخت کی چھال لگا دی کہ کسی کو اندازہ نہ ہو سکے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ دیو کو زور آزمائی کے لیے ساتھ لے گیا۔ جب دیو نے اپنی انگلیاں گاڑیں تو انھوں نے بمشکل دو انچ ہی سوراخ ڈالا اور جب دیوانے کی باری آئی تو اس نے سوراخ والی جگہ مکا مارا اور اس کی آدھی باز و درخت کے تنے میں جا گھسی۔ دیو کو اسے سو اشرفیاں دینا پڑیں۔ مگر اب دیو دیوانے جیسے مضبوط آدمی سے اکتا چکا تھا۔ اس نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے اور اُسے غار سے بھگانے کا فیصلہ کر لیا۔ دیو انتظار کرنے لگا کہ کب دیوانہ پہاڑ والا آدھا راستہ طے کرے اور کب وہ اس پر چٹانوں کا طوفان گرادے۔ مگر دیوانہ اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی بھروسا نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے خود کو ایک غار میں چھپا لیا اور اس نے چٹانیں برسنے کی آواز سنی تو وہ پکار اٹھا: "یہ آسمان سے کیا برس رہا ہے۔ لگتا ہے نرم سفید روئی کے گالے برس رہے ہیں۔" دیو نے سنا اور خود سے کہنے لگا: "خدایا! یہ کیا شخص ہے۔ میں چٹانیں گرا رہا ہوں اور وہ انھیں روئی سے تعبیر کر رہا ہے۔ بہتر ہے ایسے شخص کو دشمن کی بجائے دوست کے طور پر مان لیا جائے۔" اور اس طرح اُس نے دیوانے کو غار میں ٹھہرنے کے لیے واپس بلا لیا۔ مگر وہ اس دوران اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے متعلق سوچتا رہا۔

چنانچہ ایک دن جب کہ دیوانہ سویا پڑا تھا دیو نے اس کے سر پر زور دار مکا رسید کیا۔ مگر یاد رہے کہ دیوانہ ہر روز رات سونے سے پہلے تکیے والی جانب بڑا

کدو رکھ دیا کرتا تھا اور خود چار پائی کی پائینتی کی جانب سر رکھ کر سو جایا کرتا تھا۔ جونہی دیو نے کدو پچکا تو اس نے دیوانے کی آواز سنی: "تم نے میرا سر توڑ ڈالا ہے اس کی تو اتنی پرواہ نہیں مگر میری نیند توڑنے کی تجھے ضرور سزا ملے گی۔ دیو کے دل میں بیٹھے خوف میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ خود سے بولا: "مجھے پتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اس کو جنگل کے وسط میں لے جا کر اکیلا چھوڑ دوں گا اور بھیڑیے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔" چنانچہ ایک دن وہ دیوانے سے بولا: "آؤ دیوانے ذرا چہل قدمی کریں"۔

"بہت خوب" دیوانے نے جواب دیا۔" اور کیا خیال ہے آپس میں تھوڑی دوڑ بھی نہ لگائی جائے۔" دیو نے پوچھا۔

یقینا" دیوانے نے جواب دیا۔ "مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ تمہیں مجھے اجازت دینی چاہیے کہ میں تم سے چند گز آگے سے بھاگنا شروع کروں کیونکہ تمہاری ٹانگیں میری ٹانگوں کے مقابلے میں بہت بڑی ہیں"۔

"ہاں ٹھیک ہے" دیو نے کہا: "میں تمہیں خود سے دس منٹ پہلے بھاگنے دوں گا"۔

دیوانے نے بھاگنا شروع کیا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک گڈریے سے جا ملا۔ جو بھیڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ "کیا تم مجھے اپنی ایک بھیڑ بیچو گے؟" دیوانے نے پوچھا۔ گڈریا رضامند ہو گیا۔ دیوانے نے ایک بھیڑ پکڑی، چھری مار کر اس کا پیٹ چاک کر دیا اور اس کا جگر، انتڑیاں اور باقی چیزیں نکال کر سارے راستے میں بکھیر دیں۔ پھر اس نے گڈریے کو کہا: "اگر یہاں ایک دیو آئے اور تم سے میرا پوچھے تو اسے کہنا کہ میں نے اپنا پیٹ چاک کر کے اندر کی ساری چیزیں باہر پھینک دی ہیں تاکہ میرا وزن کم ہو جائے اور میں تیز بھاگنے کے قابل ہو جاؤں اور پھر اسے بتاتا کہ اس کے بعد میں ہوا کی طرح بھاگا اور اسے زمین پر پڑی یہ انتڑیاں دکھانا"۔

تھوڑی دیر کے بعد دیو وہاں سرپٹ دوڑتا آنکلا۔ "کیا تم نے کسی شخص کو دوڑتے ہوئے دیکھا ہے؟" دیو نے گڈریے سے پوچھا۔ گڈریے نے اُسے انتڑیوں کی کہانی سنائی اور پھر زمین کی جانب اشارہ کرنے لگا۔ "مجھے ایک چھری دو۔" دیو بولا "میں بھی ایسا ہی کروں گا کہ کہیں میں ہار نہ جاؤں۔" چنانچہ اس نے چھری پکڑی اور اوپر سے نیچے تک پیٹ چاک کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ زمین پر آگرا اور مر گیا۔ دیوانہ جو کے ایک درخت میں چھپا بیٹھا تھا چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ پھر اس نے اس کی لاش کو دو بیلوں والے ایک چھکڑے پر لادا اور اسے گاؤں لے آیا۔

جب بادشاہ نے دیو کو مردہ حالت میں دیکھا تو اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ وہ اسے گاؤں کے چوک میں لائیں اور پھر اسے جلا ڈالیں اور بادشاہ نے دیوانے کی جرات اور دلیری کے اعتراف میں اس کی عمر بھر کا خرچہ اٹھانے کا ذمہ لے لیا۔

علم، صنعت اور فطرت کے سنگم کی جانب

عیشہ لیاقت، بی ایس شعبہ کیمسٹری

صبح ابھی پوری طرح بیدار بھی نہ ہوئی تھی کہ یونیورسٹی کا سبزہ زار طلبہ کی چہل پہل سے آباد ہو چکا تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا اور فجر کے بعد کی خاموش فضا میں ہر چہرہ جوش و خروش سے دمک رہا تھا۔ حاضری مکمل ہونے اور ضروری ہدایات کے بعد قافلہ کلر کہار کی جانب روانہ ہوا۔ ناشتے کا انتظام پہلے ہی ننکانہ صاحب سے کر لیا گیا تھا تاکہ سفر کے دوران وقت ضائع نہ ہو۔ بس جیسے ہی پنجاب کے سرسبز میدانوں سے گزری، طلبہ نے ناشتے کے ساتھ خوش گپیوں، قہقہوں اور آنے والے تجربات کے خوابوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ راستے میں بدلتے ہوئے مناظر، دور تک پھیلے کھیت، چھوٹے دیہات اور سالٹ رینج کی ابتدائی جھلکیاں اس سفر کو مزید دلکش بنا رہی تھیں۔

کلر کہار کے قریب پہنچتے ہی زمین کی ساخت اور پہاڑی سلسلوں کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے فطرت خود اپنے کسی قدیم راز کی جانب رہنمائی کر رہی ہو۔ بالآخر جب ڈی جی سیمنٹ کا وسیع و عریض صنعتی کمپلیکس سامنے آیا تو طلبہ کی نگاہوں میں حیرت اور تجسس کی ایک نئی چمک پیدا ہو گئی۔ بلند و بالا ڈھانچے، جدید مشینری اور منظم صنعتی ماحول انسانی محنت، انجینئرنگ مہارت اور سائنسی ترقی کی شاندار مثال پیش کر رہے تھے۔

پلانٹ کے اندر داخل ہونے سے قبل ایک جامع حفاظتی بریفنگ دی گئی۔ طلبہ کو حفاظتی ہیلمٹ، جیکٹس اور دیگر ضروری سامان فراہم کیا گیا اور صنعتی ماحول میں احتیاطی تدابیر کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا۔ اس مرحلے نے واضح کیا کہ جدید صنعتوں میں حفاظت صرف ایک ضابطہ نہیں بلکہ ایک ثقافت کی حیثیت رکھتی ہے۔

اصل تعلیمی سفر کا آغاز اس وقت ہوا جب طلبہ نے خام مال کی پروسیسنگ کے مختلف مراحل کا مشاہدہ کیا۔ چونے کے پتھر، مٹی، جپسم اور لوہے پر مشتمل معدنیات کو

بڑے پیمانے پر سنبھالتے اور پراسیس ہوتے دیکھنا ایک منفرد تجربہ تھا۔ کلاس روم میں پڑھے گئے نظریات اچانک حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ کرشنگ، گرائنڈنگ اور ہوموجنائزیشن جیسے مراحل اب صرف کتابی اصطلاحات نہیں رہے تھے بلکہ آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہونے والے سائنسی عمل بن چکے تھے۔

دورے کا سب سے دلچسپ مرحلہ روٹری کلن کا مشاہدہ تھا۔ یہ عظیم الشان بھٹی صنعت کی دھڑکن محسوس ہوتی تھی جہاں خام مواد شدید درجہ حرارت کے زیرِاثر کلنکر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ طلبہ نے کیلسی نیشن، کیمیائی تحلیل اور نئے مرکبات کی تشکیل جیسے پیچیدہ تصورات کو عملی صورت میں دیکھا۔ کیمسٹری کے طالب علموں کے لیے یہ لمحہ کسی تجربہ گاہی خواب کی تعبیر سے کم نہ تھا۔

کوالٹی کنٹرول لیبارٹریوں کا دورہ بھی بے حد معلوماتی ثابت ہوا۔ جدید آلات، تجزیاتی تکنیکیں اور معیار کی جانچ کے منظم طریقے دیکھ کر طلبہ کو اندازہ ہوا کہ صنعت میں کیمسٹری کا کردار کس قدر بنیادی اور فیصلہ کن ہے۔ مختلف سوالات اور تبادلہ خیال نے اس تعلیمی تجربے کو مزید مؤثر بنا دیا۔

اس صنعتی دورے کا ایک اور متاثر کن پہلو ڈی جی سیمنٹ کا بارش کے پانی کو محفوظ کرنے کا منصوبہ تھا۔ یہ منصوبہ ماحول دوست صنعتی رویوں اور پائیدار ترقی کے عملی مظاہر میں سے ایک تھا۔ بارش کے پانی کو جمع کرنے، ذخیرہ کرنے اور دوبارہ استعمال میں لانے کے طریقہ کار نے طلبہ کو اس حقیقت کا احساس دلایا کہ جدید صنعتیں صرف پیداوار تک محدود نہیں بلکہ ماحول کے تحفظ اور قدرتی وسائل کے ذمہ دارانہ استعمال کی بھی پابند ہیں۔

تعلیمی سرگرمیوں کے بعد طلبہ نے ڈی جی سیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں دوپہر کا کھانا تناول کیا۔ خوشگوار ماحول، عمدہ مہمان نوازی اور دوستانہ فضا نے سب کو تازگی بخشی۔ کھانے کی میز پر سیکھے گئے اسباق، دلچسپ مشاہدات اور یادگار لمحات گفتگو کا موضوع بنے رہے۔

تاہم اس دن کا سفر ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ علم کے بعد اب فطرت اپنی بانہیں پھیلائے منتظر تھی۔ قافلہ سویک جھیل کی جانب روانہ ہوا جو کلر کہار کے پہاڑی سلسلوں میں واقع ایک دلکش قدرتی خزانہ ہے۔ جھیل تک پہنچنے کے لیے طلبہ نے جیپوں میں سفر کیا۔ کچے راستے، بلند و پست چٹانیں، پہاڑی موڑ اور ہوا کی تیز سرگوشیاں اس مختصر سفر کو ایک سنسنی خیز مہم میں تبدیل کر رہی تھیں۔ ہر موڑ پر ایک نیا منظر اور ہر لمحے میں ایک نئی خوشی پوشیدہ تھی۔

سویک جھیل پہنچ کر یوں محسوس ہوا جیسے فطرت نے اپنی تمام خوبصورتی ایک ہی مقام پر سمو دی ہو۔ نیلگوں پانی، بلند پہاڑ، خاموش فضائیں اور دور تک پھیلا سکون انسان کے اندر ایک عجیب طمانیت پیدا کر رہے تھے۔ طلبہ نے تصاویر بنائیں، قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوئے اور اس حسین ماحول میں اپنے دوستوں اور اساتذہ کے ساتھ یادگار لمحات گزارے۔ یہ مقام صنعتی شور اور مشینوں کی گونج سے بالکل مختلف ایک دنیا معلوم ہوتا تھا جہاں صرف فطرت کی آواز سنائی دیتی تھی۔

شام ڈھلنے لگی تو واپسی کا سفر شروع ہوا۔ جسم تھکن محسوس کر رہے تھے مگر ذہن تازہ تجربات اور خوبصورت یادوں سے بھرے ہوئے تھے۔ راستے میں بھیرہ کے معروف ریسٹورنٹ "اونلی صوفی" میں عشائیے کا اہتمام کیا گیا۔ روایتی پاکستانی کھانوں کی خوشبو اور دن بھر کے تجربات کی گفتگو نے اس محفل کو یادگار بنا دیا۔ طلبہ ایک دوسرے کے ساتھ تصاویر کا تبادلہ کرتے، دلچسپ واقعات دہراتے اور دن کی حسین یادوں کو سمیٹتے رہے۔

یہ سفر محض ایک صنعتی وزٹ نہیں تھا بلکہ علم، مشاہدے، قیادت، دوستی اور فطرت سے قربت کا ایک جامع تجربہ تھا۔ اس نے طلبہ کو نہ صرف صنعتی دنیا کے عملی پہلوؤں سے روشناس کرایا بلکہ انہیں ٹیم ورک، ذمہ داری، نظم و ضبط اور باہمی تعاون کی اہمیت بھی سکھائی۔ ڈی جی سیمنٹ کا یہ دورہ اور سویک جھیل کی یہ سیاحت آنے والے برسوں تک ان تمام شرکاء کے ذہنوں اور دلوں میں ایک روشن یاد کے طور پر محفوظ رہے گی۔

بلاشبہ یہ سفر اس حقیقت کی بہترین مثال تھا کہ تعلیم جب تجربے کے ساتھ جڑ جائے تو علم صرف کتابوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔

شعبۂ کیمسٹری کا ڈی جی خان سیمنٹ فیکٹری، کلر کہار کا مطالعاتی دورہ

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی: ایک گمنام کلاسیکی شاعر کی بازیافت

آصف اقبال، پی ایس، وائس چانسلر، بی جی این یو

(اس مضمون کا مقصد کلاسیکی دور (1600ء تا1900ء) کے ایک باکمال مگر فراموش شدہ شاعر، منشی دیبی پرشاد سحرؔ بدایونی، کو اہلِ ادب سے متعارف کرانا ہے۔ افسوس کہ اتنے اہم شاعر کی شخصیت اور شعری خدمات پر اب تک خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہوا۔ منشی دیبی پرشاد سحرؔ بدایونی کی بازیافت اسی ادبی کوشش کا حصہ ہے تاکہ گمنام شعرا اور ادیبوں کو دوبارہ ادبی منظرنامے پر لایا جاسکے۔)

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی کا سن پیدائش ۲۴ دسمبر ۱۸۴۰ء اور جائے پیدائش بدایوں ہے۔ "سور گیہ سحر کے بزرگوں کا وطن بانگر مئو ضلع لکھنؤ تھا آپ کے جدامجد سور گیہ حکومت رائے ملازمت کے سلسلے میں بدایوں آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے جو شرفاء کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔"[۱] سحرؔ کے والد چنی لال اخگر (آپ شاعر بھی تھے اور اخگرؔ تخلص کرتے تھے) خود بھی ایک عامل فاضل شخص تھے جنھیں عربی، فارسی، اُردو، ہندی پر دسترس حاصل تھی۔ منشی دیبی پرشاد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور شعر و سخن کی تربیت کے لیے اُنھی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں علوم ادبیہ اور کتبِ متداولہ کی تکمیل کے لیے مولوی طاہر الدین بدایونی کے مکتب میں داخل ہوئے۔ دیگر مروجہ علوم مثلاً ریاضی، فلسفہ، خطاطی و مصوری وغیرہ مختلف اساتذہ کرام سے حاصل کیے۔ "ان کے جد امجد منشی حکومت رائے ملازمت کے سلسلے میں بدایوں آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ سحر کا تعلق ایک اعلیٰ شریواستو خاندان سے تھا جو اپنی سیاسی لیاقت اور علمی صلاحیت میں ممتاز رہا ہے۔"[۲] سحرؔ فطری طور پر زود فہم تھے۔ "سحرؔ کو مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اُردو کے علاوہ فارسی اور ہندی پر زبردست قدرت تھی۔ زبان کے علاوہ مختلف علوم پر بھی اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ عروض اور فن خوش نویسی کے بھی ماہر تھے۔"[۳] تحصیل علم سے فراغت کے بعد ایک زمانہ تک سررشتہ تعلیم میں ملازمت کی اور ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے تک پہنچے اور اسی عہدہ پر ریٹائر ہوئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ بہ سبب ملازمت دہلی اور لکھنؤ میں گزارا۔ لیکن پنشن کے حصول کے بعد باقی عمر بدایوں میں بسر کی۔ اسی حوالہ سے لالہ سری رام اپنے تذکرہ "خم خانہ جاوید" المعروف بہ "ہزار داستاں" میں رقمطراز ہیں: "شباب کے ہنستے کھیلتے دن دہلی اور لکھنؤ میں گزرے۔ کشیدہ قامت...... قلمی کتابیں پنساریوں کی ردی میں شامل ہو کر کوڑیوں کے مول فروخت ہوئیں۔"[۴] سحر بدایونی نے اپنی تصنیف "رسالہ قیافہ" میں اپنے حالات منظوم انداز میں یوں بیان کیے ہیں

سنو اب حال میرا بادلِ شاد
میرا ہی نام احقر دیبی پرشاد
میری ہے ذات از قوم کایست
شری گوے ملا یا لفظ بایست[۵]

سحرؔ کی تصانیف کی تعداد کم و بیش ۲۵ کے قریب ہے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں جو اُن کے صاحب علم اور وسیع المطالعہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ رسائل و جرائد بھی ہیں۔ سحر کی مشہور تصانیف میں "نظم پروین" و "ارژنگ چین" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دو واسوخت "تحریر عشق" و "تفریق و تقریر" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ فن مساحت میں "محیط المساحت" اور "تکمیل المساحت" لکھیں۔ علم رمل پر بے نظیر، عروض پر "معیار البلاغت"، منطق پر "خلاصۃ المنطق" جیسی شاہکار کتب لکھیں۔ "مراۃ العلوم"، "رکاز الفیوض" اور "گلدستہ ادب" بھی سحرؔ کی ہی نادر روزگار کتب ہیں۔ فن خطاطی پر بھی کتاب "معیار الاملا" لکھی۔ سید رفیق مارہروی اپنی مرتبہ کتاب "ہندوؤں میں اُردو" حصہ اول در بارہ نظم میں سحرؔ کی ادبی خدمات اور خصوصاً اُردو خدمات کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں: "حضرت سحرؔ مجموعہ علوم و فنون تھے اور اپنے معاصرین میں وہ بہت بلند مرتبہ اور مقام کے حامل تھے۔ افسوس مجھے اس ہمہ داں شاعر کا اُردو کلام حسب ضرورت نہ مل سکا...... بہر حال جو کلام اِدھر اُدھر سے دستیاب ہو سکا پیش کرتا ہوں

معشوق سے ہم نے دل لگانا چھوڑا
کوچے میں پری رُخوں کے جانا چھوڑا

جب تک نہ تھے اس کے نیک و بد سے واقف
کرتے تھے عشق جب کہ جانا چھوڑا

ہم نے دانائی سے وہ نکتے نکالے عشق میں
عاشقی بھی کچھ دنوں میں ایک فن ہو جائے گا
بھرتے بھرتے آہ چھالے سب زباں میں پڑ گئے
روتے روتے خوں سے خالی سب کلیجہ ہو گیا(۶)

سحر بدایونی ایک بلند پایہ شاعر تھے جن کے کلام میں عشقیہ مضامین کے علاوہ تصوف اور حقیقت جیسے نکات بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں صنائع بدائع کا استعمال بھی ہے۔ روزمرہ، سادگی و سلاست کے علاوہ بے ساختگی کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ سحر تاریخ گوئی کے فن میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ زمانہ شباب میں لکھی گئی واسوخت میں اپنے دلی جذبات کی ترجمانی انتہائی خوبی اور مہارت سے کی ہے۔ گنپت سہائے سریوواستوا اپنے تحقیقی اور تنقیدی مقالے "اُردو شاعری کے ارتقاء میں ہندو شعراء کا حصہ میں سحؔر کی شاعری کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں: "ان کا دیوان سحر جب طبع ہوا تو بدایوں کے متعدد شعرا نے اس کی طباعت کی تاریخیں کہیں۔ سب نے اس دیوان کی بے حد تعریف کی اس کی تعریف میں منشی فاخر حسین بدایونی نے لکھا ہے

کیا لکھے کوئی وصف شعروں کا
پری مجوب ہیں خدا کی قسم
جو کہ ہیں نکتہ ور بدایوں کے
سخت مجوب ہیں خدا کی قسم

گوہر بدایونی فرماتے ہیں

کیف سخن سے مست ہوں میں جھوم جھوم کر
دیوان سحرؔ سامنے رکھا ہے چوم کر

ویریندر پرشاد سکسینہ اپنی کتاب "بدایوں کے اساتذۂ سخن'' میں سحر کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں: "جناب سحر دبستان بدایوں کے پہلے شاعر وادیب اور محقق ہیں جو ادب میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں اور اپنے عہد کے غزل گو شعرا میں آپ کا ایک مرتبہ تھا اور اپنے دور کے اُردو شعرا میں اساتذہ سخن میں شمار ہوتے تھے اور ہر صنف سخن پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے آپ کا کلام بہت سلجھا ہوا اور فنی حیثیت سے بے عیب ہے۔"(۷) سحر بدایونی کو فن تاریخ گوئی میں دسترس حاصل تھی اُنھوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تاریخیں کہیں۔ غالب کے ساتھ ان کے اچھے مراسم تھے۔ مرزا غالب جب پہلی دفعہ رام پور تشریف لائے تو سحر اُن سے ملنے کے لیے رام پور تشریف لے گئے۔ ان کے دیوان "سحر سامری" میں غالب کی وفات پر قطعات ملتے ہیں۔

مر گیا غالب جو لاثانی تھا شاعر ہند میں
لے گیا دنیائے دون سے حسرتیں کیا کیا دریغ
فکر میں اے سحرؔ بیٹھا ہوا تھا ناگہاں
یہ ندا آئی فلک سے وائے واویلا دریغ
(۱۳) (۱۲۸۵ھ)

سحر نے شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی اور ان کی شاعری کے بہت سے مجموعے شائع ہوئے۔اپنی شاعری میں مختلف اصناف سخن برتنے اور شاعری میں کثیر سرمایہ ہونے کے باوجود سحر کو وہ شہرت و پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ حق دار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر کے کلام میں کہیں قنوطیت تو کہیں حزن و یاس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔اور شاید اس یاسیت کی وجہ بھی پذیرائی نہ ملنا ہو۔

شاعری کی مختلف اصنافِ سخن پر انھیں قدرت حاصل تھی۔انھوں نے منظوم ترجمے بھی کیے۔ سحر کا کلام عشقیہ جذبات سے لبریز ہے۔ وارداتِ قلبی کو بہت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ جس میں وصل محبوب کی تمنا کا جابجا اظہار ملتا ہے۔ حُسن و عشق کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں۔ سحر نے اپنے کلمات میں تلمیحات، قرآنی الفاظ، تشبیہات و استارات، محاورات، ضرب الامثال، صنائع و بدائع کا استعمال کیا ہے۔ کلام میں متصوفانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔ سحر نے شاعرانہ تعلی سے بھی کام لیا ہے مثلاً

سحر کیا ہی سحر ہے تیرے کلام میں
پڑھتا پھرتا ہے وہ بُت اکثر ترے اشعار کو

جُھلا کچھ کہیں اے سحؔر نہیں کچھ پروا
جو سُخن فہم ہیں کہتے ہیں سُخندان مجھ کو

گنپت سہائے سریواستو "اُردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ" میں ان کی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: "سحر اپنے ماحول کے زیر اثر کسی قدر رعایت لفظی کے دلدادہ تھے مگر غزل کے پرانے عیوب گل و بلبل، صیاد و قفس، شمع و پروانہ، معشوق کی کج ادائی و بے مہری وغیرہ سے ان کا کلام بڑی حد تک پاک ہے۔ حالانکہ سحر حالیؔ اور آزادؔ کے زمانہ کے ساتھ تھے۔ مگر غالباً ان تک طرزِ جدید کی شاعری کی لہر پہنچ نہ سکی تھی۔ وہ فن شاعری میں رنگ غالب اور طرزِ آتش کے پیرو معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی اکثر مشہور غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور مؤمن وامانت کی غزلوں پر خمسے لکھے ہیں۔"(۸)

حوالہ جات

(۱) سکسینہ، ویریندر پرشاد، ''بدایوں کے اساتذہ سُخن'' کراچی: عبدالستار بدایونی وادارۂ مجلّہ بدایوں، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱

(۲) شمس بدایونی ''از خاکِ بدایوں'' بریلی: الیکٹرک پریس، ۱۹۸۵ء، ص ۲۶

(۳) ایضاً، ص ۲۶

(۴) سری رام، لالہ، ''خم خانۂ جاوید''، دہلی: کتاب ہمدرد پریس، جلد چہارم، ۱۹۲۶ء، ص ۱۱۹

(۵) سحؔر منشی دیبی پرشاد ''رسالہ قیافہ'' لکھنؤ: منشی نول کشور پریس، ۱۸۷۳ء، ص ۲،۱

(۶) سریواستو، گنپت سہائے ''اُردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ'' الٰہ آباد: اسرار کریمی پریس، ۱۹۶۹ء، ص ۲۸۰، ۲۸۱

(۷) سکسینہ، ویریندر پرشاد، ''بدایوں کے اساتذہ سُخن'' کراچی: عبدالستار بدایونی وادارۂ مجلّہ بدایوں، ۱۹۹۹ء، ص ۲۱

(۸) سریواستو، گنپت سہائے ''اُردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ'' الٰہ آباد: اسرار کریمی پریس، ۱۹۶۹ء، ص ۲۸۵

تیرا وجود

یہ جو انگوٹھیاں تو نے پہن رکھی ہیں
سنار نے گھڑی ہیں
پاؤں میں تیرے جو چمڑے کے جوتے ہیں
اِنھیں موچی نے سیا ہے
پگڑی کو تیرے جولاہے نے بنا
اور رنگریز نے رنگا ہے۔
تو ان پر اتراتا ہے
سنار، موچی، جولاہے اور رنگریز کو
اپنی جاگیر سمجھتا ہے
تیرا یہ وجود ان کے ہنر سے چمک اٹھا ہے
مگر عجب ہے کہ
تو اسی ہنر کا مذاق اڑاتا ہے
اور ہنر مندوں کو رذیل گردانتا ہے
اور باوجود اس کے اتراتا ہے
کہ تیرے پاس بھی تیرے بزرگوں کی طرح ہی
تیرا اپنا کچھ بھی نہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر ڈھیرہ

آزاد نظم

کمرے کے باہر ماں باپ بیٹھے
کسی بات پہ مسکرا رہے ہیں
اس کمرے کے بند دروازے کے
پیچھے سے ایک آواز آئی ہے
بہت زیادہ آواز
کچھ پھٹنے کی
کوئی تیز آواز تھی
بلند آواز

شاید گولی کی
وہ دیوار جس پہ ایک لکیر
لگانے پہ
اس بچے کو تھپڑ مار
دیا تھا لڑکی نے
اس دیوار پہ سرخ دھبے
تھے بڑے چھوٹے
وہ فرش جو دن میں دو

بار صاف ہوتا تھا
اس پہ کچھ بہہ رہا تھا
اس کا رنگ لال تھا
میز پہ رکھا ایک سفید
ورق صاف تھا
شاید کوئی کچھ لکھنا
چاہتا تھا
وہ سبز رنگ کا پین پاس
رکھا تھا
یہ چار سال سے اس کے
پاس تھا
پسندیدہ پین
اس کا ڈھکن نا جانے
کہاں گرا پڑا تھا
وہ کرسی جو آوازیں
نکالتی تھی
کہ اس پہ بیٹھے نفوس
کی ٹانگیں ہمیشہ
ہلتی رہتی تھیں
وہ خاموش تھی
شاید کرسی گونگی ہو گئی تھی
پرفیوم سے مہکے کمرے میں
ایک نئی خوشبو کا اضافہ
ہو گیا تھا
ایک دائمی خوشبو
خون کی خوشبو
کرسی پہ موجود اس
اکیس سالہ لڑکی کی
سوگ وار آنکھیں
ابھی بھی کھلی تھی
شاید ابھی بھی ان کا
سوگ قائم تھا
جو ان کھلی آنکھوں
میں ابھی بھی واضح تھا
دونوں ہاتھ لٹک رہے تھے
ایک سو روپے کی گولی
اکیس سال چند لمحوں
میں کھا گئی، بچہ خاموش
ہے اور اس کی آنکھوں میں
خوشی کی چمک ہے
اب تھپڑ نہیں پڑے گا
فرش اب ہفتے بعد صاف
ہو گا یا شاید روز
کیا کوئی اس اور اس میں
آئے گا اکیس سال
ایک گولی کی نظر کرنے
سفید ورق اب وہاں نہیں ہے
شاید روٹی کے خرچے کے
حساب کے لیے اٹھا لیا ہو گا
پین کا ڈھکن ابھی بھی غائب ہے
کون اسے ڈھونڈے گا
کرسی اب اس انتظار میں ہے کہ
وہ کب آواز نکالے گی
اب کون اس پہ بیٹھ کے
ٹانگیں ہلائے گا
اب وہ پھر سے اکیس سال
ایک گولی کی نظر ہوتے
دیکھے گی۔

الفت پروین
شعبہ نفسیات

مستقبل میرے ہاتھوں میں

کی بورڈ پر چلتی ہیں میری انگلیاں
کوڈ کی زبان بولتی ہے میری ذہانت۔
غلطیاں آئیں تو گھبراتی نہیں
ڈی بگ کر کے ہار کبھی مانتی نہیں۔
اسکرین کی روشنی میں خواب پلتے ہیں
بگز کے ساتھ ساتھ حوصلے بھی جلتے ہیں۔
رات کی خامشی میں محنت رنگ لاتی ہے
ہر نئی کوشش منزل کے قریب لے جاتی ہے۔
"دنیا کہتی ہے: "یہ لڑکیوں کا کام نہیں
میں کہتی ہوں: "محنت سے ناممکن کوئی کام نہیں"۔
عزم ہو دل میں تو راہیں خود بن جاتی ہیں
مشکلیں بھی ہمت کے آگے جھک جاتی ہیں۔
مصنوعی ذہانت سے میری دوستی ہے
ڈیٹا سے میری گہری آشنائی ہے۔

ہر نئی ٹیکنالوجی کو سلام میرا
ترقی کی راہوں پر ہے قدم میرا۔
کاپی پیسٹ کی عادت نہیں مجھے
اپنی سوچ سے دنیا بدلنی ہے مجھے۔
نئی راہیں تراشنا میرا خواب ہے
علم و ہنر ہی میرا انتخاب ہے۔
لیپ ٹاپ میرا ہتھیار، کوڈ میری طاقت
منطق اور فہم ہیں میری حقیقی دولت۔
فکر کی روشنی سے سفر جاری رکھنا ہے
ہر نئے چیلنج کو مسکرا کر اپنانا ہے۔
ڈیجیٹل دنیا میں بنانی ہے اپنی پہچان
علم کے افق پر لکھنی ہے اپنی داستان۔
روشن مستقبل ہے میرا
اور میرے ہاتھوں میں ہے اس کی اڑان۔

عروج فاطمہ
بی ایس سی ایس اینڈ آئی ٹی

محبت ہے!

کیا مرد و زن میں ہے جو
بس وہی اک محبت ہے ؟
تم صاحبِ بصیرت تو بنو پہلے
پھر دیکھو کائنات محبت ہے
باغ میں گل، گل میں خوشبو
آؤ! دیکھو یہ محبت ہے
اندھیرے میں مخمل سورج کی کرن
وہ منظر خود محبت ہے
چاند کی پہلی شعاع محسوس کرو
کیا لگتا نہیں محبت ہے ؟

رات میں جو بکھرے ستارے ہیں
وہ گنگناتے ہیں محبت ہے
آسمان پر ہواؤں کی لپیٹ میں
جو بادل ہیں محبت ہے
بوندوں میں الجھی ہوئی یہ برکھا
وہ سراسر ہی محبت ہے
پرندوں کی طرز پر غور کرو
وہ گیت ہے محبت ہے
تم صاحبِ بصیرت تو بنو پہلے
پھر دیکھو کائنات محبت ہے

شنا اشرف
بی ایس فزکس

زیست سفر ہے

خاردار راستوں پہ
ننگے پاؤں
عمر رینگتی ہے
آگہی کی راہ پر
درد جھیلتی ہے
کسی کی آس میں
کسی کے نگر کو
کسک کھینچتی ہے
یہ عمر، یہ درد، یہ کسک
زیست ہے
اور
زیست شعر ہے

ڈاکٹر سمیرہ نعیم
شعبہ کیمسٹری

غزل

Lorem ipsum

بن کر ہمارے نقش کا پر تو سنائے گی
یہ سطح آئنہ ہے ہمیں سو سنائے گی

بجھتا ہوا چراغ ہوں اک خیمہ گاہ کا
اب انگلی داستان میری لو سنائے گی

بے ربط گفتگو میں گزاریں گے چار پل
گندم کہوں گا میں وہ مجھے جو سنائے گی

لکھیں گے داستاں میرے پاؤں کے
آبلے گھستی ہوئی ہتھیلی تگ و دو سنائے گی

تاریخ خار و خس مجھے ازبر ہے میرے
دوست پھولوں کی بات شاخِ گل نو سنائے گی

میں چپ رہوں گا اور مسافت کی سرگزشت
اک رہ گزر کہ ہے مری راہ رو سنائے گی

اگلے ورق کو اُلٹے گی اک شام آفتاب
پہلی کہانی میری پھٹی کو سنائے گی

پھر ایک روز میں خود سے بھی ہم کلام ہوا
وہ اک سکوت جو صدیوں سے تھا تمام ہوا

ٹکا ہوا ہوں وہیں پر جہاں سے ہجرت کی
وہاں پہ تھا ہی نہیں میں جہاں قیام ہوا

ہر ایک عکس مرے عکس ہی کا پرتو ہے
اس آئینے کا مرے دم سے احترام ہوا

کسی کسی پہ کھلے رنگ رائگانی کے
کسی کسی کا سلیقے سے انہدام ہوا

مری بنت میں کوئی نقص ہے ہمیشہ سے
کسی بھی کام نہ آیا جو مجھ پہ کام ہوا

ہر ایک بار نئی صبح منتظر تھی مری
میں آفتاب کئی بار نذر شام ہوا

میاں آفتاب احمد
کمشنر ریونیو فیصل آباد

سائنس فکشن کی دنیا میں ٹیکنالوجی کی حقیقت

گوہر منیر ملکھی، کینیڈا

ہم عموماً موسمیاتی تبدیلی کو بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت، بے ترتیب بارشوں، سیلاب، خشک سالی یا پگھلتے ہوئے گلیشیئرز جیسے واقعات سے جوڑتے ہیں۔ لیکن اگر اس مسئلے کو ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موسمیاتی تبدیلی محض زمین کے ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلی کا نام نہیں؛ یہ براہِ راست انسانی زندگی، صحت، معاشرت اور مستقبل سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ ہوا جس میں ہم سانس لیتے ہیں، وہ پانی جس کے بغیر زندگی ممکن نہیں، وہ خوراک جو ہمارے جسم کو قائم رکھتی ہے اور وہ زمین جہاں ہم گھر، شہر اور تہذیبیں آباد کرتے ہیں — یہ سب ایک ایسے پیچیدہ نظام کا حصہ ہیں جو تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ چنانچہ موسمیاتی بحران صرف ماحول کے بارے میں ہمارے تصورات کو نہیں بدل رہا بلکہ انسانی وجود کے بارے میں ہمارے کئی پرانے تصورات کو بھی چیلنج کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کا سائنس فکشن پہلے کے مقابلے میں ایک مختلف نوعیت کی دنیا ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس دنیا میں مستقبل صرف خلائی سفر، روبوٹس، مصنوعی ذہانت یا حیرت انگیز نئی ایجادات کا نام نہیں۔ یہاں مستقبل کا سوال کہیں زیادہ بنیادی اور شاید زیادہ پریشان کن ہے: اگر زمین کا ماحول ہی بدل جائے تو انسان خود کس حد تک بدلنے پر مجبور ہوگا؟ کیا وہ اپنی موجودہ جسمانی اور ذہنی ساخت کے ساتھ ایک نئی اور سخت دنیا میں زندہ رہ سکے گا؟ اور اگر اسے اپنی بقا کے لیے ٹیکنالوجی، جینیاتی تبدیلی یا مصنوعی ذرائع کا سہارا لینا پڑے تو کیا وہ پھر بھی وہی انسان رہے گا جسے ہم آج جانتے ہیں؟

یہ سوال بظاہر سائنس فکشن سے تعلق رکھتے ہیں، مگر حقیقت میں ان کی جڑیں ہمارے موجودہ معاشرے میں پیوست ہیں۔

مستقبل کی کہانیاں یا حال کا آئینہ؟

سائنس فکشن کو اکثر مستقبل کی کہانی سمجھا جاتا ہے، لیکن اس صنف کی اصل قوت شاید مستقبل کی پیش گوئی کرنے سے زیادہ حال کو ایک نئے زاویے سے دکھانے میں ہے۔ ایک اچھا تخیلاتی ناول ہمیں آنے والے زمانے کی ایسی تصویر دکھاتا ہے جس میں آج کے مسائل اپنی نئی، پیچیدہ اور کبھی کبھی خوفناک شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

موسمیاتی فکشن بھی اسی روایت کا حصہ ہے۔ اس میں سیلاب زدہ شہر، پانی کی قلت کا شکار بستیاں، ناقابلِ رہائش علاقے، نقل مکانی پر مجبور انسان اور بدلتے ہوئے جسم محض مستقبل کے مناظر نہیں ہوتے؛ وہ موجودہ دنیا کے ممکنہ تسلسل کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے سوال صرف یہ نہیں رہتا کہ ''کل کیا ہوگا؟'' بلکہ ایک زیادہ اہم سوال ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے: ''آج ہم کیا کر رہے ہیں جس کی قیمت ہمیں کل ادا کرنا پڑ سکتی ہے؟''

یہاں انسانی جسم خاص اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ موسمیاتی بحران شاید سب سے پہلے اعداد و شمار، گراف اور سائنسی رپورٹس میں دکھائی دے، لیکن اس کے اثرات بالآخر انسانی جسم اور روزمرہ زندگی پر ظاہر ہوتے ہیں۔ شدید گرمی، آلودگی، بیماریوں کا پھیلاؤ، غذائی قلت، ذہنی دباؤ، ہجرت اور رہائش کا عدم تحفظ — یہ سب انسانی جسم کو متاثر کرتے ہیں۔ یوں ماحول اور جسم کے درمیان وہ فاصلہ کم ہونے لگتا ہے جسے جدید انسان کے تصور نے ایک طویل عرصے تک برقرار رکھا۔

ہم اپنے جسم کو عموماً اپنی ذات کا سب سے ذاتی اور نجی حصہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر بیماری، صحت، خوراک، ماحول اور ٹیکنالوجی کے باہمی تعلق پر غور کیا جائے

تو معلوم ہوتا ہے کہ جسم کبھی بھی مکمل طور پر آزاد اور خود مختار وجود نہیں رہا۔ ہم جو خوراک کھاتے ہیں، جس پانی کو استعمال کرتے ہیں، جس ہوا میں سانس لیتے ہیں اور جس ماحول میں رہتے ہیں، وہ سب ہماری جسمانی ساخت، صحت اور زندگی کے معیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ موسمیاتی تبدیلی اسی تعلق کو مزید نمایاں کر دیتی ہے۔ جب ماحول بدلتا ہے تو جسم بھی اس تبدیلی کا تجربہ کرتا ہے۔

کیا انسان واقعی دنیا کا مرکز ہے؟

ایک بنیادی اور دلچسپ سوال اٹھاتی ہے: کیا انسان کو دنیا کا مرکز سمجھنا درست ہے؟ (Posthumanism) یہی وہ مقام ہے جہاں معاصر مابعد انسانیت یا انسان خود ایک ایسے وسیع حیاتیاتی نظام کا حصہ ہے جس میں دوسرے جاندار، ماحول، ٹیکنالوجی اور بے شمار غیر انسانی عناصر بھی شامل ہیں؟

مابعد انسانیت کا تصور انسان کو ختم کرنے یا اس کی اہمیت سے انکار کرنے کی دعوت نہیں دیتا، بلکہ اسے ایک مختلف زاویے سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس زاویے میں انسان نہ تو مکمل طور پر خود مختار ہے اور نہ ہی فطرت سے الگ تھلگ کوئی وجود۔ وہ تعلقات کے ایک وسیع جال میں موجود ہے، جہاں اس کی بقا دوسرے انسانوں کے ساتھ ساتھ غیر انسانی زندگی، ماحول اور ٹیکنالوجی سے بھی وابستہ ہے۔

موسمیاتی سائنس فکشن اس تصور کو انتہائی مؤثر انداز میں تخیل کا حصہ بناتا ہے۔ کبھی انسان بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ خود کو تبدیل کرتا دکھائی دیتا ہے، کبھی ٹیکنالوجی اس کے جسم کا حصہ بن جاتی ہے، اور کبھی انسان اور غیر انسانی دنیا کے درمیان وہ حد دھندلی ہونے لگتی ہے جسے ہم صدیوں سے فطری، واضح اور مستقل سمجھتے آئے ہیں۔

لیکن یہاں سوال صرف جسمانی تبدیلی کا نہیں۔ انسانی زندگی ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں اجتماعی نظم، ریاستی پالیسی، طبّی نظام، معاشی حالات اور سماجی اداروں سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ جدید دنیا میں زندگی کے بارے میں فیصلے اعداد و شمار، صحت کے ریکارڈ، آبادی کے جائزوں، بیماریوں کی نگرانی اور مختلف انتظامی نظاموں کے ذریعے بھی کیے جاتے ہیں۔

جب زندگی خود انتظام کا موضوع بن جائے

کے تصور نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جدید طاقت صرف اس بات سے ظاہر نہیں ہوتی (Biopower) فرانسیسی مفکر میشل فوکو کے بایوپاور کہ حکومت کسی فرد کو کیا کرنے سے روکتی ہے۔ طاقت اس وقت بھی کام کرتی ہے جب ادارے یہ طے کرنے لگتے ہیں کہ آبادی کو کیسے محفوظ رکھا جائے، بیماریوں سے کیسے نمٹا جائے، صحت کو کس طرح بہتر بنایا جائے اور انسانی زندگی کو کس طرح منظم کیا جائے۔

موسمیاتی بحران اس معاملے کو مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ اگر کسی شہر میں پانی محدود ہو جائے تو فیصلہ کرنا ہوگا کہ پانی کس کو ملے گا، کتنی مقدار میں ملے گا اور کس بنیاد پر اس کی تقسیم ہوگی۔ اگر کوئی علاقہ رہنے کے قابل نہ رہے تو سوال پیدا ہوگا کہ وہاں کے لوگوں کو کہاں منتقل کیا جائے۔ اگر شدید گرمی انسانی صحت کے لیے خطرناک ہو جائے تو یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ کون سی آبادی محفوظ سہولیات تک رسائی حاصل کر سکے گی اور کون سی آبادی اس خطرے کو برداشت کرنے پر مجبور ہوگی۔

یہ سوال ہمیں ایک اہم حقیقت کی طرف لے جاتے ہیں: موسمیاتی بحران صرف قدرتی یا ماحولیاتی مسئلہ نہیں؛ یہ انسانی زندگی کے انتظام، وسائل کی تقسیم اور طاقت کے استعمال کا مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔

امید کا دوسرا نام: ٹیکنالوجی

انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر بڑے بحران کے ساتھ ٹیکنالوجی نے امید بھی پیدا کی ہے۔ موسمیاتی بحران کے معاملے میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ قابلِ تجدید توانائی، مصنوعی ذہانت، جدید طبّی تحقیق، جینیاتی سائنس، موسمیاتی انجینئرنگ اور دیگر سائنسی امکانات مستقبل کے لیے نئی راہیں کھول

رہے ہیں۔

لیکن سائنس فکشن ہمیں ایک ضروری احتیاط بھی یاد دلاتا ہے: ہر نئی ٹیکنالوجی اپنے ساتھ ایک نیا سوال بھی لے کر آتی ہے۔

اگر مستقبل میں انسان اپنے جسم کو تبدیل کر کے شدید گرمی، بیماری یا آلودگی کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو کیا یہ سہولت ہر شخص کو حاصل ہو گی؟ اگر جینیاتی یا حیاتیاتی ٹیکنالوجی انتہائی مہنگی ہو تو کیا صرف دولت مند طبقہ ہی ''مستقبل کا انسان'' بن سکے گا؟ اور اگر انسانی جسم، صحت اور جینیاتی ساخت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات ٹیکنالوجی کے ذریعے جمع ہونے لگیں تو ان معلومات کا اختیار کس کے پاس ہوگا؟

یوں ٹیکنالوجی بیک وقت امید اور تشویش دونوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مسئلہ صرف ٹیکنالوجی کا وجود نہیں بلکہ اس کے استعمال کا طریقہ، اس تک رسائی، اس کی قیمت اور اس کے پیچھے موجود اختیار بھی ہے۔

موسمیاتی بحران: سب کے لیے ایک جیسا نہیں

موسمیاتی تبدیلی کو عالمی مسئلہ کہنا درست ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے اثرات ہر شخص پر برابر پڑتے ہیں۔ ایک امیر خاندان شدید گرمی کے دوران بہتر رہائش، بجلی، ٹھنڈک اور طبی سہولیات حاصل کر سکتا ہے، جبکہ کم آمدنی والا فرد اسی گرمی میں ایسی جگہ کام کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے جہاں بنیادی تحفظ بھی دستیاب نہ ہو۔

اسی طرح کسی ترقی یافتہ معاشرے کے لیے موسمیاتی بحران سے متاثرہ آبادی کو دوسری جگہ منتقل کرنا شاید ایک انتظامی مسئلہ ہو، لیکن ایک غریب خاندان کے لیے یہی نقل مکانی گھر، روزگار، شناخت، سماجی تعلقات اور اپنی پوری زندگی کے خاتمے کے برابر ہو سکتی ہے۔

یہ فرق موسمیاتی فکشن کو سماجی انصاف کے سوال سے جوڑ دیتا ہے۔ مستقبل کی تباہی صرف یہ نہیں کہ زمین گرم ہو جائے؛ اصل سوال یہ بھی ہے کہ اس گرمی کی قیمت کون ادا کرے گا؟

مستقبل کے ''محفوظ'' انسان کا تصور بھی غیر جانب دار نہیں۔ اگر کسی مخصوص طبقے کو جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے بہتر تحفظ حاصل ہو، جبکہ دوسرے لوگ ماحولیاتی تباہی کے براہِ راست شکار ہوں، تو پھر مستقبل بھی طبقاتی تقسیم سے آزاد نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کہ ایک ہی دنیا میں کچھ لوگ ٹیکنالوجی کے ذریعے نئی موسمیاتی حقیقت سے خود کو محفوظ کر لیں، جبکہ دوسرے لوگ اسی تبدیلی کے سب سے شدید اثرات برداشت کرتے رہیں۔

انسان اکیلا نہیں

شاید موسمیاتی بحران کا سب سے بڑا فکری سبق یہی ہے کہ انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ صدیوں سے انسانی تہذیب نے فطرت کو ایک ایسے وسیلے کے طور پر دیکھا جسے استعمال، تبدیل اور اپنے فائدے کے لیے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ ماحولیاتی صورتِ حال ہمیں بتا رہی ہے کہ انسان فطرت سے جتنا فائدہ اٹھاتا ہے، اتنا ہی اس کے نتائج سے متاثر بھی ہوتا ہے۔

ایک جنگل کی تباہی صرف درختوں کا خاتمہ نہیں؛ اس کے اثرات پانی، مٹی، موسم، حیوانات اور بالآخر انسانی زندگی تک پہنچتے ہیں۔ سمندر میں آنے والی تبدیلی صرف سمندری حیات کا مسئلہ نہیں؛ یہ ساحلی آبادیوں، خوراک، روزگار اور معیشت سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح کسی ایک خطے میں ماحولیاتی تبدیلی کے اثرات دوسرے خطوں میں بھی ہجرت، خوراک، معیشت اور سیاسی کشمکش کی صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔

مابعد انسانیت اسی باہمی تعلق کو بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ اس میں انسان کو دنیا کا واحد اہم کردار سمجھنے کے بجائے ایک وسیع تر حیاتیاتی اور مادی دنیا کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ موسمیاتی سائنس فکشن اس تصور کو تخیل کے ذریعے زیادہ قابلِ فہم بناتا ہے، کیونکہ وہ ہمیں ایک ایسی دنیا دکھاتا ہے جہاں انسان اپنی مرضی سے الگ تھلگ زندہ نہیں رہ سکتا۔

تو کیا ٹیکنالوجی ہمیں بچا لے گی؟

شاید اس سوال کا سب سے آسان جواب ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں دینا ممکن نہیں۔ ٹیکنالوجی ہمارے مستقبل کو محفوظ بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے، لیکن وہ خود بخود ہمیں نہیں بچا سکتی۔ کوئی بھی ایجاد اس وقت تک نجات کا ذریعہ نہیں بنتی جب تک اس کے ساتھ سیاسی فیصلے، معاشی انصاف، اجتماعی ذمہ داری اور اخلاقی شعور موجود نہ ہو۔

اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ہر ماحولیاتی مسئلے کا حل کسی نئی مشین، الگورتھم، جینیاتی تبدیلی یا مصنوعی ذہانت میں چھپا ہوا ہے تو شاید ہم اس بنیادی سوال سے بچ نکلیں گے کہ وہ حالات پیدا ہی کیوں ہوئے جنہوں نے ہمیں ان ٹیکنالوجی سے خوفزدہ کرنے کے بجائے اس کے بارے میں زیادہ سنجیدہ سوالات پوچھنے پر مجبور کرتا ہے۔ کیا ہم ایسی ٹیکنالوجی چاہتے ہیں جو صرف چند لوگوں کو محفوظ رکھے، یا ایسی ٹیکنالوجی جو زیادہ منصفانہ دنیا تشکیل دے؟ کیا ہمارا مقصد صرف انسان کو بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق ڈھالنا ہے، یا ماحول کو اس حد تک بچانا بھی ہے کہ انسان کو یوں کا محتاج بنایا۔

سائنس فکشن کی اہمیت شاید یہی ہے کہ وہ ہمیں ٹیکنالوجی سے خوفزدہ کرنے کے بجائے اس کے بارے میں زیادہ سنجیدہ سوالات پوچھنے پر مجبور کرتا ہے۔

کیا ہم ایسی ٹیکنالوجی چاہتے ہیں جو صرف چند لوگوں کو محفوظ رکھے، یا ایسی ٹیکنالوجی جو زیادہ منصفانہ دنیا تشکیل دے؟ کیا ہمارا مقصد صرف انسان کو بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق ڈھالنا ہے، یا ماحول کو اس حد تک بچانا بھی ہے کہ انسان کو اپنی بنیادی فطرت تبدیل کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے؟

موسمیاتی بحران کے تناظر میں مستقبل شاید کسی ایک ایجاد کا منتظر نہیں۔ اسے ایک نئے طرزِ فکر کی ضرورت ہے——ایسے طرزِ فکر کی جو انسان کو فطرت سے الگ نہیں بلکہ اس کا حصہ سمجھے، ٹیکنالوجی کو نجات کا جادوئی حل نہیں بلکہ ایک ذمہ داری سمجھے، اور ترقی کو صرف معاشی پیداوار یا نئی ایجادات کے پیمانے سے نہ ناپے۔

معزز وائس چانسلر بابا گورو نانک یونیورسٹی
پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کے ساتھ خصوصی گفتگو

انٹرویورز: ڈاکٹر قاسم شفیق، ڈاکٹر سمیرا نعیم، ڈاکٹر یاسر سعید

پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران صاحب پاکستان کے ممتاز ماہرِ تعلیم، محقق، انجینئر اور تعلیمی منتظم ہیں، جو اس وقت بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کے وائس چانسلر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے قومی و بین الاقوامی جامعات میں تدریس، تحقیق اور انتظامی قیادت کے شعبوں میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ انجینئرنگ اور توانائی کے شعبوں میں آپ کی تحقیقی کاوشیں عالمی سطح کے معروف جرائد میں شائع ہو چکی ہیں، جبکہ آپ متعدد بین الاقوامی تحقیقی منصوبوں اور علمی سرگرمیوں سے وابستہ رہے ہیں۔

بابا گورو نانک یونیورسٹی میں آپ کی قیادت نے ادارے کی تعلیمی سمت کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ آپ نے جامعہ میں Outcome Based Education (OBE) کے نظام کو متعارف کروا کر تدریس، نصاب، جائزہ اور معیارِ تعلیم کے پورے ڈھانچے کو جدید عالمی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ Program Learning Outcomes (PLOs) اور Course Learning Outcomes (CLOs) پر مبنی نظام کے نفاذ نے جامعہ کو ایک ایسی تعلیمی شناخت عطا کی ہے جس میں طلبہ کی حقیقی علمی و عملی استعداد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کے نظریے کے تحت تحقیق، معیارِ تعلیم، ڈیجیٹلائزیشن، فیکلٹی ڈویلپمنٹ اور ادارہ جاتی اصلاحات کے میدان میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔

علمی وقار، انتظامی بصیرت اور مستقبل شناس قیادت کے حامل پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران بابا گورو نانک یونیورسٹی کو ایک ایسی جامعہ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشاں ہیں جو علم، تحقیق، جدت، اخلاقی اقدار اور سماجی ذمہ داری کو یکجا کرتے ہوئے قومی و بین الاقوامی سطح پر اپنی منفرد شناخت قائم کر سکے۔ ان کی قیادت میں جامعہ صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک فکری اور علمی تحریک کے طور پر ابھر رہی ہے۔

آئیے! پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران صاحب، وائس چانسلر بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب سے خصوصی گفتگو کرتے ہیں، جہاں ہم ان کی تعلیمی و پیشہ ورانہ جدوجہد، قیادت کے تجربات اور بابا گورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کے نظریے، تعلیمی سفر، کامیابیوں اور مستقبل کے منصوبوں کے حوالے سے اہم باتیں جانیں گے۔

سوال 1:

آپ کا تعلق یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور جیسے ایک مضبوط اور پرانے تعلیمی ادارے سے رہا ہے۔ ایک بہترین طرز پر قائم شدہ یونیورسٹی سے ایک نئی جامعہ بابا گورونانک یونیورسٹی تک کا سفر آپ کے لیے کیسا تجربہ رہا اور یہاں آکر آپ نے سب سے بڑا چیلنج کیا محسوس کیا؟

جواب:
یونیورسٹی آف انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی سے بابا گورو نانک تک کا سفر میرے لیے انتہائی دلچسپ اور پرجوش رہا۔ یو ای ٹی ایک پرانا انجینیئرنگ ادارہ ہے جہاں زیادہ تر نظام بخوبی متعین ہے، جبکہ بی جی این یو ایک نئی یونیورسٹی ہے جو ابھی اپنے ڈھانچے کو ترقی دے رہی ہے۔ جب میں یہاں آیا تو ادارہ جاتی فریم ورک میں زیادہ کچھ موجود نہ تھا — صرف یونیورسٹی ایکٹ 2020 اور انڈر گریجویٹ ریگولیشنز تھے۔ باقی سب کام آنے والے وقت میں کرنا تھا۔ ایک اور چیلنج فیکلٹی کی تعداد اور جدید تدریسی تکنیکوں اور ٹولز سے ان کی آگاہی کا فقدان تھا۔

سوال 2:
پاکستان کی اکثر جامعات میں Outcome Based Education محض Documentation تک محدود رہ جاتی ہے۔ آپ کس طرح یقینی بنا رہے ہیں کہ PLOs اور CLOs صرف فائلوں کا حصہ نہ رہیں بلکہ حقیقی Classroom Practice میں بھی نظر آئیں؟

جواب:
جی ہاں، بدقسمتی سے آپ درست کہہ رہے ہیں۔ آؤٹ کم بیسڈ ایجوکیشن ایک خوبصورت تصور ہے، لیکن بہت سی جگہوں پر یہ محض فائلیں بھرنے تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ تاہم بی جی این یو کا تجربہ مختلف ہوگا۔ ہم فیکلٹی کی اندرونی صلاحیت سازی کے لیے ابتدائی مرحلے میں بھرپور رہنمائی فراہم کر رہے ہیں۔
جہاں یہ نظام مطلوبہ نتائج نہ دے سکا، وہاں بنیادی وجہ اس نظام کی سمجھ کا فقدان تھا۔ اسی لیے ابتدائی تربیتی پروگراموں کے بعد ہم نے اپنی اندرونی صلاحیت تیار کی OBE کے مختلف پہلوؤں میں خود کو ترقی دی جا رہی ہے اور پندرہ روزہ فیکلٹی ورکشاپس کے ذریعے ماہرین OBE پر مشتمل ایک ٹیم دوسروں کی مدد کر رہی ہے۔

سوال 3:
آپ کے خیال میں روایتی تعلیمی Outcome Based Education نظام کو کس حد تک Challenge کرتی ہے؟

جواب:
OBE روایتی تعلیمی نظام کو چیلنج نہیں کرتا بلکہ اسے مضبوط بناتا ہے۔ یہ اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ نتائج پہلے سے متعین کیے جائیں، تدریسی و تعلیمی عمل کو ان نتائج کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے، اور جانچ کے طریقوں کو بھی اسی کے مطابق ڈھالا جائے۔ یہ روایتی نظام کی ان کمزوریوں کو دور کرتا ہے جو وقت کے ساتھ پرانی ہو جاتی ہیں۔

سوال 4:
بابا گورو نانک یونیورسٹی اس وقت ایک عبوری مرحلے سے گزر رہی ہے جہاں تدریسی سرگرمیاں مختلف مقامات پر جاری ہیں۔ ایسے حالات میں Institutional Coherence برقرار رکھنا کس قدر مشکل ہے؟

جواب:
جی ہاں، یہ تبدیلی انتظامیہ اور فیکلٹی دونوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔ ہم ابھی عارضی انتظامات کے تحت کام کر رہے ہیں اور تعلیمی سال 27-2026 کے آغاز سے پہلے مستقل کیمپس میں منتقل ہونے کے لیے پرجوش ہیں۔
گزشتہ چار سال میں یونیورسٹی کے ملازمین نے بنیادی ڈھانچے کی کمی کے باوجود استقامت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس عبوری دور کے باوجود طلبہ اور فیکلٹی نے پہلے بیچ کو مقررہ مدت میں فارغ التحصیل کروا کر قابلِ ستائش کارکردگی دکھائی ہے۔ گزشتہ چھ ماہ سے ہم فارغ التحصیل طلبہ کے ساتھ مل کر ان کو ملازمت کے قابل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہر طالب علم کو پیشہ ورانہ اور باہمی رابطے کی مہارتوں میں جانچا، تربیت دی، اور دوبارہ جانچا گیا ہے۔

سوال 5:
آپ نے یونیورسٹی کی مرکزی عمارتوں کی تکمیل کو اہم ترجیحات میں شامل کیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مستقل کیمپس کسی جامعہ کی Academic Psychology کو بھی متاثر کرتا ہے؟

جواب:
جی ہاں، تعمیراتی ڈھانچہ یقیناً سیکھنے والے کی نفسیات پر اثر ڈالتا ہے۔ طلبہ اور فیکلٹی کے لیے گفت و شنید اور علمی مکالمے کی مناسب جگہیں طلبہ کے ذہنی ڈھانچے کا مستقل حصہ بن جاتی ہیں۔ سازگار ماحول اپنائیت اور تعلق کا احساس پیدا کرتا ہے۔

سوال 6:
کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نئی جامعات کو ابتدا ہی سے Research Intensive Model اپنانا چاہیے یا پہلے Teaching Excellence پر توجہ دینی چاہیے؟

جواب:
تحقیق اور تدریس دونوں اعلیٰ تعلیمی نظام کے ناگزیر ستون ہیں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ تدریسی عمدگی کو تحقیقی شدت پر فوقیت حاصل ہے، لیکن جب ہم تدریسی عمدگی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب تحقیق سے متاثر تدریس ہے۔
کلاس روم کو ایک چھوٹے پیمانے کا سماجی یا صنعتی نمونہ بنانا چاہیے جہاں حقیقی مسائل حل کرنے کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ ایک ایسا تحقیقی ماڈل جو صرف اشاعتوں کو

فروغ دے اور سماج کی حقیقی ترقی کو نظرانداز کرے، تنہا ایک اچھا خیال نہیں ہے۔

سوال 7:

ایک نئی یونیورسٹی کے طور پر آپ کو زیادہ توجہ Infrastructure پر دینی پڑتی ہے یا Academic Culture Building پر؟

جواب:

بنیادی ڈھانچہ تعلیمی ماحول کا ایک اہم حصہ ہے، لیکن علمی ثقافت کی تعمیر کو ترجیح حاصل ہے۔ کسی ادارے کی ثقافت اس ہوا کی مانند ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ جو نہ نظر آتی ہے، نہ اس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔
بی جی این یو میں ایک سازگار اور معاون علمی ثقافت کی تعمیر سب سے بڑی ترجیح ہے—ایک ایسی ثقافت جو ہماری اقدار کی عکاسی کرے۔ جو تخلیقیت، استقامت، ہمدردی، تنوع، باہمی انحصار اور شفافیت کو فروغ دے۔

سوال 8:

پاکستان میں اکثر جامعات Quantity Based Expansion کی طرف جاتی ہیں۔ آپ کے نزدیک Quality Assurance کو برقرار رکھتے ہوئے Expansion کس طرح ممکن ہے؟

جواب:

تعلیمی ماحول میں معیار کی یقین دہانی انتہائی اہم ہے۔ ہم ایسے فارغ التحصیل طلبہ تیار کرنے پر بھی توجہ دے رہے ہیں جو صنعتی اور سماجی مسائل حل کر سکیں۔ معیار کو کبھی تعداد کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے۔

سوال 9:

آپ کے خیال میں ننکانہ صاحب جیسے تاریخی شہر میں ایک جدید یونیورسٹی قائم کرنا کس نوعیت کی Intellectual Responsibility پیدا کرتا ہے؟

جواب:

ننکانہ صاحب جیسے تاریخی شہر میں باباگورونانک کا قیام صرف ایک یونیورسٹی کا قیام نہیں بلکہ ایک فکری و علمی ذمہ داری ہے۔ اس کا مقصد طلبہ میں تنقیدی سوچ، تحقیق اور تخلیقی فکر کو فروغ دے کر معاشرے کے مستقبل کی تشکیل کرنا ہے۔

سوال 10:

آپ بارہا Academic Direction کی بات کرتے ہیں۔ ایک جامعہ کی Leadership زیادہ اہم ہوتی ہے یا Direction طے کرنے میں Institutional Systems؟

جواب:

ادارہ جاتی نظام قیادت سے بلاشبہ زیادہ اہم ہیں، لیکن انہی ادارہ جاتی نظاموں کو تعمیر کرنے کے لیے قیادت درکار ہوتی ہے۔ ادارہ جاتی نظام اس وقت ناکارہ رہیں گے جب وہ کئی نسلوں میں بہتر قائدین پیدا کرنے میں ناکام ہوں۔ لہٰذا ادارہ جاتی قیادت اور نظاموں کو ہم آہنگ ہو کر ادارے کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہیے۔

سوال 11:

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی جامعات میں Curriculum اور Industry Requirements کے درمیان ابھی بھی ایک Gap موجود ہے؟

جواب:

جی ہاں، تعلیمی نصاب اور صنعت کی ضروریات کے درمیان ایک خلا موجود ہے، لیکن یہ اتنی گہری خلیج نہیں جتنی کہ یہ بات سننے میں آتی ہے۔ اصل مسئلہ تدریس و تعلم کے عمل کی غیر مؤثریت ہے جو فارغ التحصیل طلبہ میں فرسودگی پیدا کرتی ہے۔ یونیورسٹیوں کو چاہیے کہ وہ اپنا معیار بلند کریں اور تدریس و تعلم کے عمل کو بہتر بنائیں۔

سوال 12:

آپ کی نظر میں ایک کامیاب Graduate کی تعریف کیا ہے؟

جواب:

ایک کامیاب فارغ التحصیل وہ ہے جو حاصل کردہ علم اور مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے پیچیدہ مسائل شناخت اور حل کر سکے۔ وہ لچکدار ہو اور ضرورت پڑنے پر نئی مہارتیں اپنانے کے لیے تیار ہو۔ وہ مؤثر طریقے سے بات چیت کر سکے، بڑی ٹیموں میں کام کر سکے، اور قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرے۔

سوال 13:

ایک نئی جامعہ میں Creativity اور Discipline کے درمیان توازن پیدا کرنا کس حد تک مشکل ہوتا ہے؟

جواب:

نظم و ضبط اور تخلیقیت دونوں کامیابی کے اجزاء ہیں—ایک کے بغیر دوسرا بے کار ہے۔ ہم اسے "تخلیقی نظم و ضبط" کہہ سکتے ہیں۔ نظم و ضبط تخلیقیت کو دبانا نہیں چاہیے، اور تخلیقیت کے نام پر انتشار کو بھی برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔

معزز وائس چانسلر باباگورونانک یونیورسٹی، پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے

سوال 14:
آپ کے خیال میں Higher Education Commission کی Policies اور Ground Realities کے درمیان کس نوعیت کا فاصلہ موجود ہے؟

جواب:
HEC کی پالیسیاں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں معقول یکسانیت یقینی بنانے کے لیے رہنما اصول فراہم کرتی ہیں۔ قواعد و ضوابط اور زمینی حقائق کے درمیان ایک فاصلہ ضرور موجود ہے، لیکن یہ کسی بھی حقیقی نظام میں ہوتا ہے اور ہمیشہ بہتری کی گنجائش رہتی ہے۔

سوال 15:
AI اور Technological Transformation کے اس دور میں آپ باباگورونانک یونیورسٹی کو کس سمت میں لے جانا چاہتے ہیں؟

جواب:
مصنوعی ذہانت ہماری روزمرہ زندگی کی ہر چیز کو نئی شکل دے رہی ہے۔ یونیورسٹیوں کو اس نئے کھلاڑی سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ ہمیں اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور موجودہ نظاموں کو بہتر بنانا چاہیے۔ تدریس و تعلم کے عمل سے لے کر صنعتی نظاموں کی ترقی تک AI اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔

سوال 16:
اگر آپ باباگورونانک یونیورسٹی کے لیے ایک مستقل Academic Legacy چھوڑنا چاہیں تو وہ کیا ہوگی؟

جواب:
میں تخلیقیت، استقامت، ہمدردی، تنوع، باہمی انحصار اور ثقافت استوار کرنا چاہتا ہوں —— ایک ایسی ثقافت جہاں فیصلوں کی شفافیت ہو اور ایک دوسرے کی بات سننے کو فروغ ملے۔

خاموش تصویریں
بولتی کہانیاں

کل سے آج تک، سفرِ قیادت

پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران، وائس چانسلر بابا گورونانک یونیورسٹی، ننکانہ صاحب

پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل، سابقہ وائس چانسلر، بابا گورونانک یونیورسٹی، ننکانہ صاحب

بابا گرونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب

بابا گورو نانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کے اسپورٹس گالا 2025 کی افتتاحی تقریب کا باوقار آغاز سابقہ وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل کے دستِ افتتاح سے ہوا۔

فیکلٹی آف نیچرل سائنسز، ڈائریکٹر اکیڈمکس پروفیسر ڈاکٹر کفیل احمد اور پروفیسر ڈاکٹر اظہر رسول رسہ کشی کے مقابلے میں اپنی ٹیم کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے۔

کھیل سے کردار تک۔

ہر اُچھال، ایک نیا خواب۔

ننھے بازو، بلند حوصلے۔

محبت، روحانیت اور ثقافت

رقصِ سم، جلوۂ فن۔

وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کی بوٹنی کارنیول 2025 کے پہلے روز خصوصی شرکت

وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کی کمپیوٹر سائنس و آئی ٹی کے طلبہ سے ملاقات، منصوبوں کا جائزہ اور جدتِ فکر کی حوصلہ افزائی۔

ہم ہیں بنیان المرصوص - پاکستانی مسلح افواج سے یکجہتی کے اظہار کے لیے سیاسی و فکری رہنماؤں کا پُرامن مارچ

بومبو کانفرنس 2025—فکر، تحقیق اور فطرت کا حسین امتزاج۔ شعبۂ نباتات نے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کی سرپرستی اور چیئرمین شعبۂ نباتات ڈاکٹر کفیل احمد کی قیادت میں اس کامیاب علمی اجتماع کا انعقاد کیا۔

باباگورونانک میں ایگروٹورازم کے فروغ کے لیے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کی کاوشیں

معروف اداکار اور پی ٹی وی کی معروف شخصیت سلمان شاہد کی وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران سے خصوصی ملاقات، فنونِ لطیفہ، تھیٹر اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کے حوالے سے تبادلۂ خیال

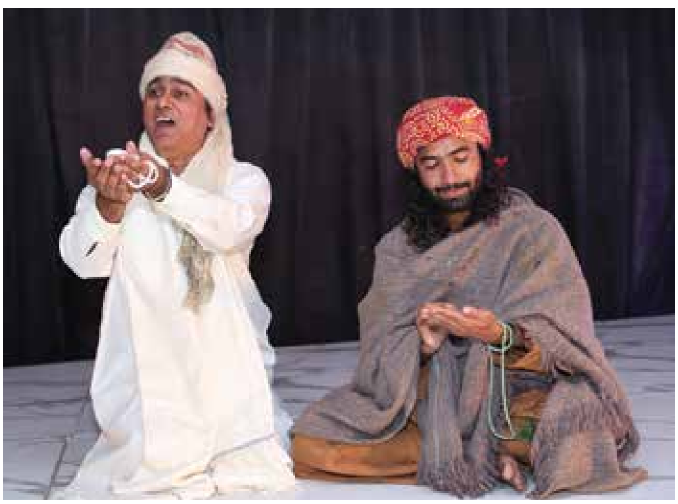

باباگورونانک یونیورسٹی میں ڈرامہ و تھیٹر سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ''داستانِ سنگت'' کی بیٹھک

شعبۂ فنونِ لطیفہ کے طلبہ کی تحقیقی مقالہ جات کی پیشکش۔ تخلیقی فکر تحقیقی بصیرت اور فنّی صلاحیتوں کا خوب صورت اظہار۔

مقامی برادری سے مؤثر روابط کے سلسلے میں وائس چانسلر کی کمیونیٹی انگیجمنٹ ٹیم سے خصوصی ملاقات

شعبۂ باٹنی کے زیرِ اہتمام مفاہمتی یادداشت پر دستخط کی تقریب تعلیمی و صنعتی روابط کے فروغ اور طلبہ کے لیے پیشہ ورانہ مواقع کی فراہمی کے عزم کے ساتھ منعقد ہوئی۔

ایل سی ای آئی اسٹیم منصوبے کے تحت سرکاری اسکول کا تعلیمی دورہ

شعبۂ زولوجی کے طلبہ کے مطالعاتی دورے کی ایک یادگار جھلک

شعبۂ انگریزی میں نئے طلبہ کی استقبالیہ تقریب میں وائس چانسلر کی شرکت

حیاتیاتی تنوع کے عالمی دن کی مناسبت سے دو روزہ سمپوزیم کا انعقاد، جہاں حیاتیاتی تنوع کے تحفظ ماحولیاتی توازن اور پائیدار مستقبل کے حوالے سے علمی و تحقیقی مباحث کا اہتمام کیا گیا۔

،لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری اور بابا گورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کے مابین مفاہمتی یادداشت پر دستخط کی تقریب۔

انسدادِ منشیات کے حوالے سے طلبہ کے لیے آگاہی تقریب، جس میں اینٹی نارکوٹکس فورس پنجاب کے ڈپٹی ڈائریکٹر، میجر محمد نذیر، نے خصوصی شرکت کی۔

پنجاب ہائر ایجوکیشن کمیشن کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر اقرار احمد خاں کا باباگورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر شاہد عمران کو خصوصی ویلکم۔

ڈاکٹر عثمان یونس، کنوینر داخلہ کمیٹی، کے ساتھ ایک خصوصی نشست

1. داخلہ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے آپ کی بنیادی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

جواب:

داخلہ صرف فارم وصول کرنے کا عمل نہیں بلکہ طلبہ کے روشن مستقبل کی بنیاد رکھنے کا مرحلہ ہے۔ میری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ ہر امیدوار کو مکمل شفافیت، انصاف اور میرٹ کی بنیاد پر داخلہ ملے۔ اشتہار کے اجرا سے لے کر میرٹ لسٹوں، داخلوں کی تکمیل اور طلبہ کی رہنمائی تک پورے عمل کی نگرانی ہماری ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر اہل طالب علم کو بروقت، آسان اور خوشگوار داخلہ کا تجربہ فراہم کیا جائے۔

2. ستمبر 2024 کے بعد داخلہ نظام میں کیا نمایاں تبدیلیاں کی گئی ہیں؟

جواب:

ہم نے داخلہ نظام کو مکمل طور پر ڈیجیٹل اور طلبہ دوست بنا دیا ہے۔ اب طلبہ گھر بیٹھے درخواست جمع کروا سکتے ہیں، فیس ادا کر سکتے ہیں، میرٹ لسٹ دیکھ سکتے ہیں اور داخلہ کے تمام مراحل آن لائن مکمل کر سکتے ہیں۔ منتخب طلبہ کو ایس ایم ایس اور فون کال کے ذریعے بھی فوری اطلاع دی جاتی ہے۔ ہمارا مقصد صرف آن لائن نظام متعارف کروانا نہیں بلکہ طلبہ کا وقت، اخراجات اور مشکلات کم کرنا ہے تاکہ وہ آسانی سے اپنی تعلیم کا سفر شروع کر سکیں۔

3. اس سال کن شعبوں میں طلبہ کی دلچسپی زیادہ دیکھی جا رہی ہے؟

جواب:

الحمدللہ اس سال بابا گورو نانک یونیورسٹی میں داخلوں کا رجحان انتہائی حوصلہ افزا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے وابستہ پروگرامز جیسے کمپیوٹر سائنس، مصنوعی ذہانت اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ بزنس ایڈمنسٹریشن، انگریزی اور پنجابی کے شعبوں میں بھی طلبہ کی غیر معمولی دلچسپی دیکھنے میں آ رہی ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ طلبہ اب صرف ڈگری نہیں بلکہ ایسے پروگراموں کا انتخاب کر رہے ہیں جو انہیں تحقیق، عملی مہارت، قیادت اور بہتر روزگار کے مواقع فراہم کریں۔ بابا گورو نانک یونیورسٹی کا جدید نصاب، تجربہ کار فیکلٹی اور آوٹ کم بیسڈ

ایجوکیشن کا نظام ان پروگراموں کو مزید پرکشش بنا رہا ہے، جس کے باعث ہر سال داخلوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

4. بابا گورو نانک یونیورسٹی کو دیگر جامعات سے منفرد کیا بناتا ہے؟

جواب:

ہر یونیورسٹی ڈگری دیتی ہے، لیکن بابا گورو نانک یونیورسٹی اپنے طلبہ کو مستقبل کے لیے تیار کرتی ہے۔ یہاں جدید نصاب، تجربہ کار اساتذہ، آوٹ کم بیسڈ ایجوکیشن، انڈسٹری لنکیجز، تحقیقی ماحول اور عملی مہارتوں پر یکساں توجہ دی جاتی ہے۔

ہم صرف کلاس روم تک محدود تعلیم پر یقین نہیں رکھتے بلکہ طلبہ کو انٹرن شپ، پراجیکٹس، ریسرچ، اسکل ڈویلپمنٹ اور کیریئر رہنمائی کے ذریعے عملی زندگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بابا گورو نانک یونیورسٹی مختصر عرصے میں معیاری، جدید اور طلبہ دوست جامعہ کے طور پر اپنی منفرد پہچان بنا چکی ہے۔

5. داخلے کے خواہشمند طلبہ کو درخواست جمع کرواتے وقت کن باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے؟

جواب:

داخلہ کسی بھی طالب علم کے تعلیمی سفر کا پہلا اور اہم مرحلہ ہوتا ہے، اس لیے میری درخواست ہے کہ طلبہ جلد بازی کے بجائے مکمل تیاری کے ساتھ درخواست جمع کروائیں۔ داخلہ پالیسی، اہلیت کے معیار اور ہدایات کو غور سے پڑھیں، تمام دستاویزات درست

اور مکمل فراہم کریں اور درخواست آخری تاریخ سے پہلے جمع کروائیں۔
اس کے ساتھ اپنا موبائل نمبر اور ای میل درست درج کریں، کیونکہ داخلہ سے متعلق تمام اہم معلومات انہی ذرائع سے فراہم کی جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ صرف یونیورسٹی کی آفیشل ویب سائٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر جاری ہونے والی معلومات پر اعتماد کریں تاکہ کسی بھی غلط فہمی سے بچا جا سکے۔ ہمارا مقصد ہے کہ ہر طالب علم آسانی اور اعتماد کے ساتھ داخلہ حاصل کر سکے۔
6. یونیورسٹی میں میرٹ اور شفافیت کو کیسے یقینی بنایا جاتا ہے؟
جواب:
باباگورو نانک یونیورسٹی میں میرٹ صرف ایک پالیسی نہیں بلکہ ہماری اولین ترجیح ہے۔ داخلہ کے تمام مراحل مکمل شفافیت، انصاف اور طے شدہ قواعد کے مطابق انجام دیے جاتے ہیں تاکہ ہر اہل طالب علم کو اس کا جائز حق مل سکے۔
ہر پروگرام کی میرٹ لسٹ پہلے متعلقہ فوکل پرسن تیار کرتا ہے، پھر شعبہ کے سربراہ اس کی تصدیق کرتے ہیں، جس کے بعد داخلہ آفس اسے آن لائن پورٹل پر جاری کرتا ہے۔ یہ منظم اور کثیر مرحلہ نظام کسی بھی غلطی یا بے ضابطگی کے امکانات کو کم سے کم کرتا ہے اور طلبہ کے اعتماد کو مزید مضبوط بناتا ہے۔
7. دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لیے یونیورسٹی کیا سہولیات فراہم کر رہی ہے؟
جواب:
ہم سمجھتے ہیں کہ فاصلے کبھی بھی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے چاہییں۔ اسی سوچ کے تحت باباگورو نانک یونیورسٹی نے داخلہ کے تمام مراحل کو آن لائن کر دیا ہے، تاکہ ملک کے کسی بھی حصے سے طلبہ آسانی سے داخلہ حاصل کر سکیں۔
مزید برآں، ہیلپ ڈیسک، فون، ای میل اور سوشل میڈیا کے ذریعے مسلسل رہنمائی فراہم کی جاتی ہے۔ یونیورسٹی 60 کلومیٹر کے دائرے میں ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی مہیا کر رہی ہے، جبکہ طلبہ و طالبات کے لیے جدید ہاسٹلز بھی جلد فعال کیے جا رہے ہیں۔
ہماری خواہش ہے کہ ہر طالب علم کو ایک محفوظ، سہل اور معیاری تعلیمی ماحول میسر آئے، چاہے وہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔
8. مالی مشکلات کا سامنا کرنے والے طلبہ کے لیے یونیورسٹی کی کیا پالیسی ہے؟
جواب:
باباگورونانک یونیورسٹی مستحق اور میرٹ پر پورا اترنے والے طلبہ کے لیے مختلف سرکاری اور نجی اسکالرشپس اور فنانشل ایڈ پروگرامز فراہم کر رہی ہے۔
اس وقت یونیورسٹی میں ہونہار اسکالرشپ، بیف اسکالرشپ، میرٹ بیس اسکالرشپ، نیڈ بیس اسکالرشپ، کنشپ اسکالرشپ، بیت المال، سیف اسکالرشپ سمیت متعدد مالی معاونت کے پروگرام دستیاب ہیں۔ ہمارا عزم ہے کہ ہر قابل طالب علم کو معیاری تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ مالی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنی تعلیم اور مستقبل پر بھرپور توجہ دے سکے
9. یونیورسٹی طلبہ کی عملی تربیت، انڈسٹری روابط اور روزگار کے مواقع بڑھانے کے لیے کیا اقدامات کر رہی ہے؟
جواب:
آج کی دنیا میں صرف ڈگری کافی نہیں، بلکہ عملی مہارت اور صنعتی تجربہ کامیابی کی اصل کنجی ہیں۔ اسی لیے باباگورو نانک یونیورسٹی میں تعلیم کو صنعت کی ضروریات سے جوڑا جا رہا ہے تاکہ طلبہ گریجویشن کے بعد اعتماد کے ساتھ عملی میدان میں قدم رکھ سکیں۔
ہم طلبہ کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جو عملی زندگی میں ان کے کام آئے۔ اسی لیے نصاب کو انڈسٹری کی ضروریات کے مطابق بنایا گیا ہے، مختلف اداروں کے ساتھ تعاون بڑھایا گیا ہے، اور ماہرین کی تجاویز کے مطابق اسے باقاعدگی سے اپ ڈیٹ کیا جاتا ہے۔
طلبہ کو انٹرن شپ، انڈسٹری وزٹس، سیمینارز، ورکشاپس، کیریئر کونسلنگ، اسکل ڈویلپمنٹ پروگرامز اور جاب پلیسمنٹ کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں تاکہ وہ نہ صرف ملازمت حاصل کریں بلکہ مستقبل کے کامیاب پروفیشنلز، محققین اور کاروباری رہنما بھی بن سکیں۔
ہمارا وژن صرف گریجویٹس تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے باصلاحیت نوجوان پیدا کرنا ہے جو ملکی ترقی، معاشی استحکام اور عالمی سطح پر پاکستان کا نام روشن کرنے میں مؤثر کردار ادا کریں۔

پنجابی ثقافت

تُر دا ویلا

دل دے اُجڑے پجُڑے گھر وچ
یاداں چمچڑیکاں وانگوں
ڈیرے لائے۔
کس نوں آکھاں، کیویں آکھاں
دل دے گھر نوں آن وسائے۔
سوچاں کتیاں بلّیاں وانگوں
پھرن آوارہ۔
گلاں ڈور دی گُنجل وانگوں
ودھدیاں جاون
کوئی سرا وی ہتھ نہ آئے۔
بے صبرا اپن،
دل وچ اندروں کنڈی لا کے
اِنج بیٹھا اے
جیویں پکے من دے وچ شک بیٹھا اے۔
تُر دا ویلا
اِنج لگدا اے
جیویں سَپ پٹاری دے وچ نہ وی ہوئے،
ڈر لگدا اے۔
جاڑے دی رُت مکدیاں مکدیاں
سدھراں دے رُکھ ڈھے جاندے نیں۔
لکھ سُنایئے دل دے دُکھڑے
فیر وی دل وچ رہ جاندے نیں۔

ڈاکٹر قاسم شفیق
شعبۂ انگریزی

گلاں کردے لفظ

ڈاکٹر سید غضنفر حسین بخاری صدر شعبہ پنجابی باباگورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب

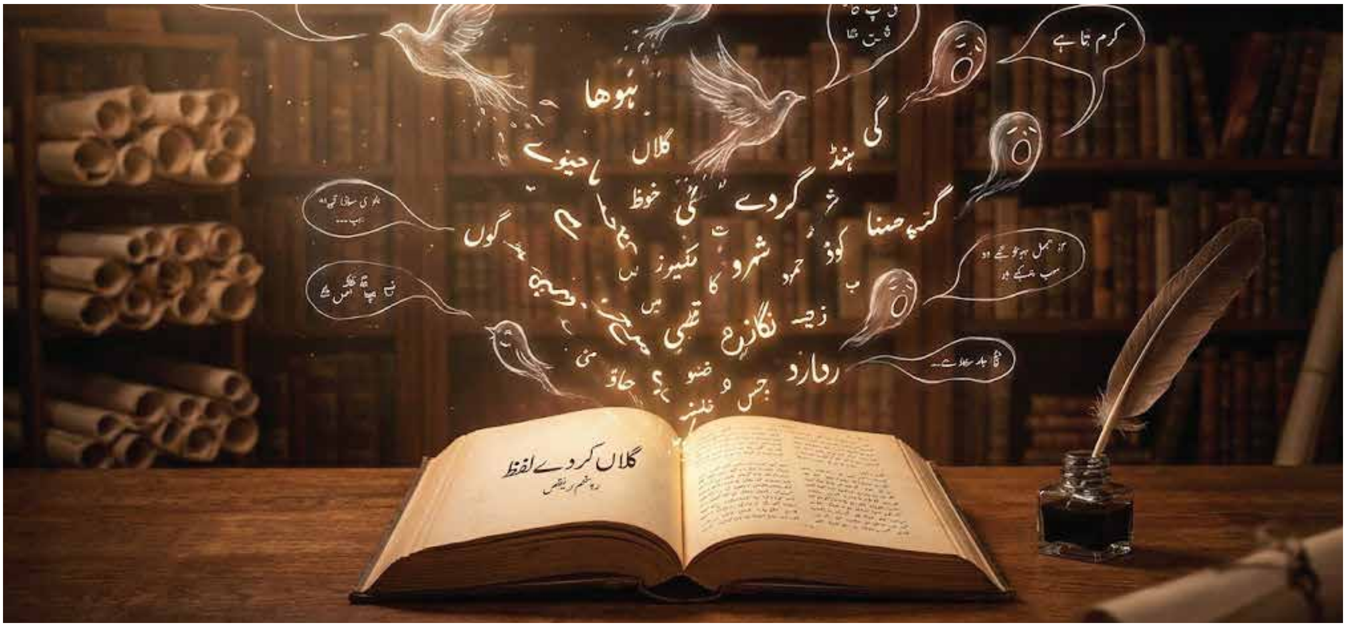

اوہ اپنی ماں بولی نال پریم کرن والا اک ودھیا کہانی کار سی۔اوہ ماں بولی دے لفظاں نال تے لفظ اوہدے نال بڑا پیار کردے سی۔پریم دی ایہہ کہانی ایس حد تائیں ودھ چکی سی پئی جدوں اوہ لکھن لئی قلم چُکدا تے لفظ آپو وچ کھبڑن لگ پیندے پئی میری واری اے تے میں لکھینا اے۔لفظ اک دوجے دے ہتھی پے جاندے ،فیر اوہ وارو واری بڑے پیار نال اوہناں نوں کاغذ تے الیکدا۔لفظ اوہدے چنگے ورتارے پاروں اوہنوں دل و جانوں اپنا امام من دے سن۔اوہنوں ''صاحب'' آکھدے۔اوہ وی لفظاں دی بڑی عزت تے اوہناں دا بڑا مان کردا سی۔لفظاں نوں چوکھا آدر مان دیندا سی ایس کارن لفظ اوہدے گوڑھے بیلی وی بن چکے سن۔جگ وچ جے کوئی اوہدا اپنا ہے سی تے اوہ لفظ ای سن۔جدوں ایہہ پریت حدوں ودھی تے محبت دے جذبے نے لفظاں نوں زبان دے دتی۔لفظ اوہدے نال گلاں کرن لگ پے سن۔گھاٹ سی تے بس اکو نہ اوہدا کوئی گھر سی نہ کوئی بوہا،جے کجھ ہے سی تے اوہ اوہدی لائبریری سی تے اوہدیاں لکھتاں جنہاں نال اوہ بچیاں واکن پیار کردا سی۔

آخر اوہ انسان سی ،اکلاپے نے اندرو اندری اوہنوں کھا چھڈیا سی۔اک دن جدوں دکھ حدوں ودھیا تے اوہنوں دکھ دے لفظ نے کہیا ''صاحب !کنے ہور دکھ جریں گا؟۔تیرے وچ بڑا حوصلہ اے۔حوصلے دا اکھر اگانہہ ودھیا تے اوہنے اوہدی وینی پھڑ کے کہیا''صاحب!حوصلہ تاں تیرے وچ بوہت ہے میں تے ویکھ کے حیران آں ایہہ تاں لوکائیاں وچ ہوندا ای بوہت گھٹ اے''۔اوہ اپنی لائبریری وچ بیٹھا اج بڑا اداس سی۔اوہنے اپنی حیاتی وچ بڑے دکھ جرے سن۔دکھ فیر بولیا ''تیرا تے میرا ساتھ بڑے چر توں اے بیلیا !۔دکھ دی گل سن کے خشی دا لفظ بولیا میرے نال تے تیرے مقدر رُسے ای رہے ایس گل دا مینوں بڑا ہرکھ '' اے۔خشی لفظ دی گل سن کے مقدر نے کہیا''نہیں خشی ایہہ گل نہیں ''ایس بندے دے لیکھ وچ ای ایسراں لکھیا سی''۔نہ بیوی نہ بچے۔ تسی ہے جے ناں میرے انگ ساک، تہاڈے نالوں ودھ مینوں کنے پیار کرناں سی'' اوہ لفظاں دیاں گلاں سن کے چوکھے چر مگروں بولیا۔''پتر وی کمائی کر کے دیندے نیں ڈھڈ بھرن لئی تسی وی تے مینوں کمائی کر کے دیندے او پر حقی گل تے ایہہ اے کہ میں ہن تھک گیا ہاں''۔اوہدی ایہہ گل سن کے حیاتی دے لفظ نے اوہدی بانہہ پھڑی تے کہن لگا''ویکھ میرے وچ کنے حرف نے ،ح ی ا ت ی ،میرے پنج حرف نیں۔میرا پندھ کرنا ایڈا سوکھا نہیں،میں حیاتی ہاں توں مینوں پنج نال لنگھان دی کوشش کیتی پر میں تیرے کولوں پنج نال ہنڈائی نہیں گئی توں تھکناں ای سی۔

صاحب دیاں اکھاں بند ہو چکیاں سن،موت دا اکھر اگانہہ ودھیا اوہنے کہیا''بیلیا! میں موت ہاں کہن توں تے میرے وچ تن حرف نیں م و ت پر میں بڑی عجیب شئے آں۔جس دن تینوں ٹکراں گی تیرے دکھ مکاداں گی توں گھابر نہ،موت دے اکھر نے مٹھا جیہا ہسدیاں کہیا موت لفظ دیاں اکھاں وچ ہنجو وی سن۔

صاحب دیاں اپنیاں بند اکھاں وی گلیاں ہو چکیاں سن۔فرشتے آگئے اوہناں نیں اوہدی روح نوں اوہدے پنڈے وچ کڈھ لتا۔روح دے لفظ نے اگانہہ ودھ کے اوہدی روح نوں اپنے کلاوے وچ لے کے نال لا لتا۔حیاتی ،دکھ،محبت،مقدر،ڈاہایں مار مار روندے پے سن تے اوہدی لائبریریاں دیاں سبھے کتاباں ویہن کر رہیاں سن۔

پریتم داس ٹھاکر دا فارسی اکھراں وچ اَن چھپیا قصہ پُورن بھگت

ڈاکٹر واصف لطیف، شعبہ پنجابی، جی سی یونیورسٹی، لاہور

دنیا بھر وانگوں پنجاب دھرتی نال وی کئی طرح دے قصے کہانیاں جڑے ہوئے نیں۔ ایہہ قصے کہانیاں کجھ علاقائی تے رہتلی نیں جدکہ کجھ ودیشی نیں جیہناں نوں کئی کئی شاعراں نے آپو اپنے انداز نال پنجابی زبان وچ بیانیا اے۔ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں، سسّی پنوں، سہتی مراد، کیماں ملکی، روڈا جلالی، سوہنا زینی تے راج بی بی نامدار جیہے قصیاں دا تعلق نرول پنجاب دھرتی نال اے جیہڑے بڑی کامیابی نال پنجابی ادب وچ بیان ہوئے تے چنگی چوکھی شہرت وی کھٹی۔ اجیہے قصیاں وچوں اک نویکلا تے اُچیچا پنجابی قصہ پُورن بھگت اے جیہدا تعلق سیالکوٹ دھرتی نال اے۔ پُورن بھگت سیالکوٹ دے راجے سلوان دا پتر سی جیہڑا ہندو راجا سی۔ ایس راں ایہہ پنجاب دا کلا قصہ اے جو ہندوانہ پچھوکڑ رکھدا اے۔ ایہہ قصہ ہن تک درجناں شاعر پنجابی وچ لکھ چکے نیں جیہناں وچوں قادر یار دا لکھیا قصہ سبھ نالوں مشہور اے۔

احمد حسین قریشی قلعداری اپنی کتاب "پنجابی ادب کی مختصر تاریخ" وچ پُورن بھگت دا قصہ رچن والے 13 اڈو اڈ شاعراں دی دس پاندے نیں۔

ڈاکٹر میاں ظفر مقبول اپنی کتاب "قصہ کاری" وچ اٹھارھویں تے انیہویں صدی وچ رچے پورن بھگت دے 15 قصیاں دی دس پاندے نیں تے نال آکھدے نیں کہ ویہویں صدی وچ وی ایہہ قصہ ودھیرا لکھیا گیا۔

ڈاکٹر شہلا نگار ہوراں اپنے مضمون مشمولہ "پارکھ" وچ پورن بھگت دے قصیاں بارے کوئی کھوج نہیں کیتی تے احمد حسین قریشی قلعداری دا 13 قصیاں دا ای حوالہ دتا اے۔ حالانکہ اوہناں دے مضمون توں پہلاں ڈاکٹر میاں ظفر مقبول دی کتاب "قصہ کاری" چھاپے چڑھ چکی سی تے ڈاکٹر شہباز ملک دی کتابیات وچ موجود سی۔

ڈاکٹر شہباز ملک ہوراں دی "پنجابی کتابیات" پہلی جلد وچ 36 تے دُوجی جلد وچ 10 منظوم تے نثری قصیاں تے اوہناں دے لکھاریاں دی دس پائی گئی اے۔ ایس راں ہن تیکر پورن بھگت دا قصہ لکھن والے لکھاریاں دی گنتری گھٹ ودھ 44 بن دی اے۔

ڈاکٹر شہباز ملک ہوراں دی پنجابی کتابیات وچ دتی شاہ مکھی وچ چھپے قصیاں دی گنتی اپنی تھاں سلا ہن جوگ کم اے پر خورے حالے کنے ای قصے شاہ مکھی تے گورمکھی وچ اَن چھپے ہون گے۔ اجیہے اَن چھپیاں، اَن سودھیاں تے ہتھ لکھتی قصیاں وچوں اک قصہ پریتم داس ٹھاکر دا لکھیا اے جیہڑا چڑھدے پنجاب دے ضلع کپور تھلہ دے اک پنڈ سلطان پور نواسی دا ہندو شاعر سی۔ ایس قصے دی اُچیچتا ایہہ اے کہ چڑھدے پنجاب دے ہندو شاعر نے گورمکھی تے دیوناگری دی بجائے ایس قصے نوں شاہ مکھی وچ رچیا اے تے حالے تیکر ایس مخطوطے نوں سودھیا تے چھاپیا نہیں گیا۔

راقم نوں ایہہ قصہ انٹرنیٹ سرچ دے دوران آن لائن کتاباں دی ویب سائٹ "ریختہ" توں ملیا۔ ایس توں اڈ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ دے مخطوطہ سیکشن وچ ایہہ ہتھ لکھتی قصہ موجود اے جیہڑا انٹرنیٹ اُتے آرکائیو ڈیجیٹل لائبریری توں وی ڈاؤن لوڈ کیتا جا سکدا اے۔ مخطوطے دے مڈھ وچ مڈھلی جانکاری تے نوعیت ہیٹھلے اکھراں راہیں دتی گئی اے:

" پُورن بھگت مؤلفہ پریتم داس ٹھاکر سلطانپوری، السنہ پنجابی بخط فارسی نستعلیق، 58 صفحات، اندازہ 18 سطور فی صفحہ، کتاب قلمی۔"

پریتم داس ٹھاکر چڑھدے پنجاب دے ضلع کپور تھلہ دے اک پنڈ سلطان پور نواسی دا رہن والا ہندو شاعر سی۔ قصے دے اخیر وچ اپنے پنڈ، محلے تے والد دے ناں دی دس ایس راں پاندے نیں:

اصلی پنڈ میرا پہلا ہے ٹِبہ، آسن وچ سلطان پور لایا جی
محلہ مہریاں وچ رہائش میری، قصہ پُورن دا جتھے رچایا جی
جوندا رام ہے باپ داناں بھائی، جس دے گھر اندر جنم پایا جی

پریتم داس ٹھاکر بڑا عاجز، نمانا، مسکین تے ہما تڑ جیہا بندہ سی۔ اوہنے صرف پنجھی سالاں دی عمر وچ ایہہ قصہ لکھیا۔ اپنی حیاتی تے عاجزی، انکساری دا ذکر قصے دے اخیر وچ ایس راں کردے نیں:

پُورن بھگت دا گرنتھ تیار ہویا، لکھ لکھ میں شکر منایا جی
جیسی بُدھ میری تیسا لکھ دتا، بُدھ وان نہیں بن وکھایا جی
بھُل چُک سب غلطیاں معاف کرو، ہتھ جوڑ کے میں بخشایا جی
بُرے کرماں اندر میری نیت رہندی، بھلا کرم نہ کدی کمایا جی
پچّی برس دی عمر ہے کل میری، دسو دنیا دا بھیت کیہہ پایا جی
پریتم داس ورگا کوئی ہوؤ مورکھ؟ جیہنے رام نہ مکھوں دھیایا جی

پریتم داس نے ایہہ قصہ 2007ء بکرمی وچ صرف پنجھی سال دی عمر وچ مکمل کیتا سی۔ اوہ لکھدے نیں پئی ویہہ سوست وچ قصہ شروع کر کے اوسے سال ای مکاوی دتا سی:

ویہہ سوست توں قصہ شروع کر کے، اوسے سال دے وچ مکا دیندا

:پریتم داس کوئی ویدیا حکیم وی سی۔ قصے دے اخیر وچ اپنے تیار کیتے دنداں دے منجن داذکر کر دے ہوئے اوہدے فائدے گنواندے لکھدے نیں
منجن دنداں دا اک تیار کیتا، صفت اوس دی کوی سُنا دیندا
اِس نوں آکھدے نیں لقمان منجن، دند موتیاں وانگ چمکا دیندا
گوشت خورے تے ہور بیماریاں نوں، دھکّے مار کے گھروں بھجّا دیندا
سرد گرم ہو کے دند ہون دُکھدے، اوہناں تائیں وی تُرت ہٹا دیندا
پریتم داس مونہہ دے سارے روگ جاندے، بغل گندھ نوں وی دھمکا دیندا
شاعر نے قصے دے اخیر وچ اپنے سنگیاں بیلیاں تے اوہناں دے کم کاج دا وی ذکر کیتا اے۔ کجھ قریبی دوستاں داذکر کرن مگروں چار بھراواں داذکر کر دے نیں جیہڑے اوہدے جگری
: یار نیں۔ یاراں بیلیاں دے ذکر توں شاعر دی مردم شناسی تے سُچجے بیلیاں دی پرکھ دا اندازہ لایا جاسکدا اے
ایہہ چارے ہن دِلبر میرے دِلوں نہ مول بھُلاواں
اوہ بھی دِل وچ سمجھن مینوں چھوٹیاں وانگ بھراواں
ہور شہر وچ یار بہت ہن آؤجی بیٹھو والے
جیکر ناں اوہناں دے لکھاں کاغذ کر دیاں کالے
پریتم داس نہ رہنی یاروسو ہنی حسن جوانی
آخر سب دا خاک چ واسا، کیا راجہ کیا رانی
پریتم داس ٹھاکر دا لکھیا "پُورن بھگت "59 صفحیاں دا قصہ اے جیہنوں شاعر نے آپے "اصلی تے نواں " قصہ آکھیا اے۔ ایس قصے دی سبھ نالوں اہم گل ایہہ اے کہ چڑھدے پنجاب دے ہندو شاعر دا لکھیا سارا قصہ فارسی اکھراں وچ اے تے حالے تک اَن چھپیا اے۔ سارا قصہ بنداں دی شکل وچ جیہدے وچ کئی تھاں تے کبیشر، دوہڑے، کبتاں، دوتار چندتے شاہ مکھی، گورمکھی پٹی مطابق سی حرفیاں شامل کیتیاں گئیاں نیں جیہڑیاں قصے دا ای حصہ نیں۔ سارے قصے دے سرناویں وی پنجابی فارسی اکھراں وچ نیں۔ قصے وچ بیان ہوئی کہانی، تھاواں تے واقعات باقی قصیاں وانگ ای نیں۔ شاعر نے تھاؤں تھائیں حکمت و دانش دیاں گلاں وی کیتاں نیں جیہڑیاں قصے دی افادیت ودھا کے اوہنوں کلاسیکی حیثیت
: بخشدیاں نیں۔ ونگی پاروں کجھ مقطعے ویکھو
پریتم داس تقدیر نوں کون موڑے، لکھے لیکھ مٹائے نہ جاوندے جی
پریتم داس کیہہ اوہناں نوں ہے گھاٹا، جیہڑے رب دی آس لگا بیٹھے
پریتم داس تُوں بھی اک دن چلنا ہے، مورکھ موت کیوں دِلوں بھُلا دتی
پریتم داس نہ بندہ کجھ کرن جوگا، کردا سبھ کجھ آپ کرتار یارو
پریتم داس نہ کوئی وی دُکھ رہندا، ہووے رب جے آپ دیال سائیں
پریتم داس کیہہ کسے نوں دُکھ دے کے، لیجاونا ایس جہان وچوں
پریتم داس نہ کوئی وی دکھ رہندا، جیکر سمریئے رام دا نام لوکو
پریتم داس نے ایہہ قصہ بھاویں بھر جوانی وچ لکھیا سی پر اوہنوں دنیاداری دی چنگی بھلی سمجھ بُوجھ سی۔ اوہنے پھر ٹُر کے دنیا ہنڈائی سی۔ اوہدے دنیاداری تے پیسے دے حوالے نال وچار
: ملاحظہ کرو
ایس پیسے دی کراں کیہہ صفت یارو، پیسے نال سبھ چیز مل جاوندی اے
پیسہ لا دیندا جنگل وچ منگل، جیہبا کِویاں دی ایہو پئی گاوندی اے
پیسہ پاس تے ماپے کرن آدر، بھین پیار دے نال بُلاوندی اے
پیسہ نہیں تاں اپنے گھر والی، اوہ بھی چِلھیوں دُور بٹھلاوندی اے
پیسہ نہ ہووے جیکر جیب اندر، کوئی چیز نہ چِت نوں بھاوندی اے
پریتم داس سبھ پیسے دا بھجن کردے، یاد ربّ دی کسے نُوں آوندی اے؟
مُکدی گل ایہہ پئی پریتم داس ٹھاکر دا ایہہ قصہ "پُورن ادب" وچ چنگا تے جاندار وادھا اے۔ شاہ مکھی وچ لکھے ایس قصے وچ بھاویں املا دیاں کجھ خامیاں نیں پر کہانی، قصہ کاری، شعری تخیل، اسلوب تے اندازِ بیان دے اعتبار نال بلاشبہ ایہہ اک اعلیٰ پائے دا قصہ اے۔

خالی ہتھ

شہزونیہ اشفاق، بی ایس پنجابی

اک غریب آدمی اپنے پنڈ توں روزی روٹی دی پاروں نکلیا تے اک جنگل وچ اپڑ گیا تے لکڑیاں اکٹھیاں کرن لگ پیا۔ لکڑیاں اکٹھیاں کردا کردا بوہت اگے نکل گیا اوہ پریشان ہو گیا تے باہر نکلن دا راہ لبھن لگ پیا۔ اوس نوں خالی ویران جنگل وچ اک ککھاں دی کلی نظر آئی۔ اوہ اوس ول ٹرپیا۔ اوس کلی وچ اک میلے کپڑے پائی اک بڈھا بابا بیٹھا سی۔ اوتھے کجھ ٹُٹیا پھٹیا سامان تے اس بابے توں علاوہ کجھ نئیں سی۔ اوس نے بابے کولوں باہر جاون دا راہ پچھیا، اوس بڈھے نے اشارے نال دسیا مونہوں کجھ نہیں بولیا۔

اوہ چپ کر کے باہر نکلیا تے اپنیاں لکڑیاں چک کے اوس دے دسے راہ تے ٹرپیا۔ اچن چیتے اک خیال وچ اوس نے پچھے مڑ کے ویکھیا تے جھونپڑی غائب سی۔ تھوڑا ہور اگے جا کے اوہنے تھک کے لکڑیاں، بیٹھاں رکھیاں تے اک واری فیر پیچھے ویکھیا تے پورا جنگل ای غائب سی کھلا خالی میدان نظری آوندا پیا سی اوہ جھٹ کو اوس خالی بھوئیں نوں ویکھدا رہیا تے فیر اپنا کٹھا کیتا بالن چاون لگا تے اوہ وی غائب سی۔

دنیا دی لوڑ پوری کرن دے سفر تے نکلیا خالی ہتھ مسافر اخیر تے فیر خالی ہتھ رہ گیا۔

نظماں ہتھی پے گئیاں

ڈاکٹر سید غضنفر حسین بخاری صدر شعبہ پنجابی بابا گورونانک یونیورسٹی ننکانہ صاحب

شہر دا اک منیا پر منیا شاعر سی اصغر جیہڑا رات دن دلاں نوں ٹُمبن والیاں نظماں لکھدا سی اوہدے کول اک چمڑے دے غلاف والی پرانی ڈائری سی جس وچ اوہنے اپنی ساری حیاتی دی کمائی یعنی اپنیاں نظماں لکھ رکھیاں سن پر اصغر نوں ایہ کنوں کن خبر وی نہیں سی پئی جیہڑے جذبات اوہ کاغذ تے اتار دا اے اوہ کاغذ دے اندر ہی اک دوجے دے جانی دشمن بن چکے نیں ڈائری دے بند ہوندیاں ہی اوتھے اک مہائیدھ چھڑ جاندا اجہی جنگ چھڑ جاندی سی جتھے ہر نظم دوجی نوں گھٹیا ثابت کرن وچ لگی رہندی سی۔

رولا اوہدوں ودھیا جدوں اصغر نوں اک بہت وڈے سرکاری مشاعرے وچ بلایا گیا اوتھے اصغر نے اپنی اک نظم "وٹس اپ دا لاسٹ سین" پڑھی مشاعرے وچ ایویں واہ واہ ہوئی پئی لوکاں نے اصغر نوں موڈھیاں تے چالتا، جدوں اصغر گھر آیا تے اوہنے ڈائری بند کیتی تاں "وٹس اپ دا لاسٹ سین" نظم ہنکار نال پاگل ہو گئی اوہ ڈائری دے پنڈے تے لت مار کے کھلو گئی تے دوجیاں نظماں نوں سوانیاں واکن بانہاں ٹنگ کے دونویں ہتھ وکھیاں تے رکھ کے چھبیاں دے دے کے طعنے دین لگ پئی کہ تسی سبھاں نے ویکھیا تہاڈی تاں اوقات ہی کوئی نہیں پورے شہر وچ صرف میرے ہی ناں دے نعرے وجے نیں میں ہی اس ڈائری دی ملکہ ہاں تے تسیں ساریاں بس مٹی دا اوہ ڈھیر او جہیدے اپر مکھیاں بیٹھنا وی پسند نئیں کردیاں

ایہ گل سن کے دوجیاں نظماں جیہڑیاں دیس پنجاب پنجابی اتے پنجابیت تے غریبی تے لکھیاں سن اوہناں دا لہو ابلن لگ پیا کوڑ نال اک غزل نے اگے ودھ کے جواب دتا پئی توں تاں بس دو دناں دی چمک ایں اصل سچائی تاں میرے اندر لکی اے بس فیر کیہ سی نظماں گتھم گتھا ہو گئیاں تے اک دوجے دے ہتھی پے گئیاں رات دے ہنھیرے وچ ڈائری دے اندر اک کہرام مچ گیا کینہ تے نفرت اینی ودھ گئی پئی نظماں نے اک دوجے دے حرف نوچنے شروع کر دتے کسے نے کسے دا قافیہ پاڑ دتا تے کسے نے کسے دی ردیف کھچ لئی جیہڑی نظم مشاعرے توں آئی سی اوہدے ہنکار نال دوجیاں نظماں نے اوہدے پورے پورے مصرعے پاڑ کے تیہہ وبیہہ کر دتے۔ اوہنے اوس غزل دے مقطعے تے مطلع نوں فنا کر دتا۔

اگلی صبح اصغر بلیک کافی دا کپ لے کے اپنے پڑھن والے کمرے وچ بیٹھا تے اوہنے اگلے مشاعرے دی تیاری لئی اپنی چمڑے دی ڈائری کھولی ڈائری کھولدیاں ہی اوہدے ہتھوں کافی دا کپ چھٹ گیا کاغذ تے ایویں دا منظر سی جیویں کوئی وڈی جنگ ہو کے ہٹی ہووے کتاب دے پنے تھوڑے تھوڑے غائب سن کتے حرف کٹے ہوئے سن تے کتے پورا مصرعہ ہی مٹیا ہویا سی وٹس اپ دا لاسٹ سین دا صرف سرناواں ہی بچیا سی اتے تھلے اک اکھر وی پورا نہیں سی جیویں لفظ کاغذ توں خود ہی آپو ماری (خودکشی) کر کے اُڈ گئے ہون۔ اصغر نے سر پھڑ لیا تے اوہنوں سمجھ نہ آئی پئی اوہدے ہتھوں لکھے ہوئے لفظ اپنی انا ضد تے حسد وچ سڑ کے کیوں سواہ ہو گئے نیں۔

تھانے دار دے دراز وچ پیا موبائل

فخر النساء، بی ایس پنجابی

نور پور پنڈ وچ غیرت دے ناں اپر قتل توں بعد ہر پاسے خوف تے اداسی سی جیویں پورے پنڈ دا ساہ رک گیا ہووے۔ ہر بندہ ترٹھا سئی پئی اچن چیتے ایہہ کیہ بھانا ورت گیا۔ اک کڑی تے منڈے دی لاش ڈنگراں والی حویلی وچ پئی سی۔ نور پور پنڈ دا رواج سی پئی ایتھوں دے وسنیک دُکھ سُکھ وچ اکدوجے نال سانجھ پاندے سن۔ ایس لئی ساڈے گھر والیاں نے مقتولاں دے گھر دی روٹی ورجئی۔ اوہناں دے چُلھے ٹھنڈے پئے سن تے دوجے پاسے پُلس نے پورے پنڈ نوں گھیرا پایا ہویا سی۔

پر پُلس دا مقصد قاتل لبھنا گھٹ تے پنڈ والیاں نوں کھجل کرنا بوہتا جاپدا سی۔ حد تے اودوں ہوئی جدوں دینہ دی کنی نال ایس ایچ او افتخار چوہدری تے اوہدے سپاہی مقتول دے رشتے داراں دے گھراں وچ وڑ گئے۔ اوہناں نے رولا پا دتا پئی سویر دے ست وج گئے نیں تے تھانے دار صاحب لئی لسی دا گلاس ہجے تک تیار نئیں ہویا؟ صرف ایس گل توں اوہناں نوں سویلے سویلے لسی کیوں نئیں پیائی گئی، پلس نے مقتول دے لگدے لیندیاں دیاں مجھاں تے گاواں دھکو دھکی کھول لتیاں تے تھانے ہک دتیاں۔ پنڈ والے ہتھ جوڑدے رہ گئے پر پلس والیاں نوں کوئی ترس نہ آیا۔ گل ایتھے ہی ختم نہ ہوئی، اوہناں نے تلاشی دے بہانے گھراں وچوں سارے فون بھی کھولتے، جنہاں وچ اک فون میرا وی سی۔ میں مقتولاں دے گھر ویڑھے وچ کھلوتی اچن چیتے اک پلسیے نے جھپٹا مار کے میرے ہتھوں فون کھو لتا اوہنوں لگا میں پلس دی ویڈیو بنا رہی آں۔ مینوں ایویں لگا جیویں امبر میرے اپر آڈگیا ہووے فون ہتھوں کھسدے ای میرے پیراں ہیٹھوں بھوئیں نکل گئی۔ میرا بلڈ پریشر ودھ گیا تے اکھاں وچوں ہنجو رک نئیں سن رہے سن۔ اوس فون وچ کوئی نریاں تصویراں نئیں سن، میری دو سالاں دی محنت سی—اک پوری کتاب، جیہڑی میں راتاں جاگ جاگ کے، اِک اِک لفظ جوڑ کے لکھی سی۔ پنجابی دیاں کہانیاں دی کتاب جو میرے پروفیسر نے لکھائی سی میں یونیورسٹی جاندی تاں اوس کتاب دے آہرے ای لگی رہندی میں نوٹ پیڈ اپر دو سو توں ودھ صفحیاں دی کتاب لکھی لتی سی میرے کول تے اس کھرڑے توں اڈ ہور کاپی وی کوئی نئیں سی۔ مینوں ستر سو وہماں نے سکندر یونانی دی فوج وانگوں گھیر گھتیا ہویا سی پئیجے پلس والیاں نے کوڑ وچ فون بھن دتا یا ڈیٹا اڑا دتا، تاں میری دو سالاں دی محنت ضائع ہو جائے گی تے میرا کتاب والا سفنہ تباہ ہو جاوے گا۔ پولیس دا کوئی اعتبار نئیں سی، اوہ غصے وچ یا رشوت لئی فون توڑ وی سکدے سن۔ میں فیصلہ کر لتا پئی میں ہتھ تے ہتھ دھر کے نئیں بہہ سکدی، مینوں اپنا فون ہر حال وچ واپس چاہیدا سی۔ میرے گھر والے کہن کڑیئے فون ای نہ نواں لے داں گے میں سمجھا سمجھا تھک گئی پئی فون دی دی گل نئیں رولا اوس کتاب دا اے جو وچ اے۔ گھر والے کتاب دی اہمیت نوں نہیں سن سمجھ رہے میں سوچدی جے ایناں دی کوئی مجھ گاں پلس لے جاندی تے میں ایناں نوں کہندی پئی نہ چنتنک ہوو مجھ گاں ای اے نہ ہور لے لواں گے تے ایناں نے میرے ہتھی پے جانا سی خیر میں اپنے بھرا شمشاد نوں نال لیا، جیہڑا ساڈے ٹبر دا تکھا منڈا سی۔ اسیں دونوں موٹر سائیکل تے تھانے پجے۔ تھانے دے باہر مقتول دے رشتے دار مجھاں چھڈوان لئی منتاں ترلے کر رہے سن۔ شمشاد نے اک سپاہی نوں چاہ پانی دا لالچ دے کے گلاں وچ لایا تے پچھیا پئی کھوئے ہوئے فون کتھے نیں۔ جواب سن کے میرے ہوش اڑ گئے پئی سارے فون ایس ایچ او صاحب نے اپنے کمرے دی میز دے دراز وچ رکھ کے تالا لایا ہویا اے۔ اوہدی گل سن کے میرا ساہ نلی وچ اٹک گیا۔ ایس ایچ او دے دراز وچوں فون کڈھنا بہت وڈا خطرہ سی، پر میں متا پکا لتا سی میں کسے وی صورت وچ اپنی کتاب دا ڈیٹا ضائع نئیں ہون دینا میں رب کولوں مدد دی دعا کیتی ملے اسیں ایناں رولیاں وچ ای ساں رب نے سبب پیدا کر دتا ایہہ موقع اودوں ملیا جدوں پنڈ دے نمبردار نے تھانے دے باہر رولا پا دتا پئی اوہ میڈیا والیاں نوں بلا رہیا اے۔ پریس کانفرنس کیتی جاوے گی۔ ایس ایچ او کوڑ وچ پیر پٹدا ہویا اپنے آفس وچوں باہر نکلیا تاں جے نمبردار نوں تراہ سکے۔ کمرہ خالی سی، پر میز دے دراز نوں تالا لگا ہویا سی۔ میں برقعہ پایا ہویا سی، میں ہولی جیہے ایس ایچ او دے کمرے وچ وڑ گئی۔ میرے دل دی دھڑکن اینی تیز سی پئی مینوں اپنے کناں وچ سنائی دے رہی سی۔ میز تے چابیاں دا گچھا پیا سی، پر کیہڑی چابی دراز دی سی؟ میں پہلی چابی لائی. نہ کھلیا۔ دوجی چابی لائی. نہ کھلیا تیجی چابی گھمائی تے کڑک دی آواز نال تالا کھل گیا۔

میں جلدی نال دراز کھولیا۔ اندر ست اٹھ فون پئے سن۔ میں کالھ نال فون دیکھے، تے چوتھے نمبر تے میرا نیلا فون پیا سی میں اوہنوں چکیا تے اپنے برقعے دی جیب وچ پا لیا۔ اودوں ہی باہروں بوٹاں دی بھاری آواز آئی، ایس ایچ او واپس آ رہیا سی میں کالھ نال دراز بند کیتا، تالا اوسراں ہی لما دتا تے میز تے پئی اک فائل چک کے باہر لے بوہے ول مڑی ہی ساں تاں ایس ایچ او اندر وڑ آیا۔ اوہنے مینوں دیکھ کے اکھاں کڈھیاں پئی اوئے کڑیے، اندر کیہ کر رہی ایں؟ میں اپنی گھبراہٹ چھپاندے ہوئے، کنبدی آواز وچ کہیا جناب ساڈے ڈنگر کھولے نیں، اوہدی عرضی دینی سی، باہر کوئی سن نئیں رہا۔ ایس ایچ او نے کوڑ نال مینوں باہر نکلن دا اشارہ کیتا میں کالھ نال باہر نکل، وڈی آئی عرضی والی۔ میرے کنی ایس ایچ او دی واج پئی۔

میں تھانے توں باہر آئی، شمشاد موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے کھلوتا سی۔ میں پچھے بیٹھی تے اسیں پنڈ ول نوں اِنج موٹر سائیکل بھجائی جیویں پچھے موت لگی ہووے۔ پنڈ دی نہر تے جا کے میں موٹر سائیکل رکواندی آں۔ جیب وچوں فون کڈھ کے سکرین آن کردی آں، تاں سکرین تے میری کتاب دا ٹائیٹل چمک رہیا ہندا اے۔ دو سالاں دی محنت بالکل محفوظ سی۔ اوہدا سفنہ سچ ہو جان والا سی۔

ਜੀਵਨ ਸਫਲਤਾ ਲਈ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਜ਼ਰੂਰੀ

ਸੁਰਿੰਦਰ ਮੰਡ (94173 24543)

ਜਿਸਤੋਂ ਜੋ ਵੀ ਲਈਏ, ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਕਰੀਦਾ, ਨਹੀਂ ਤਾਂ ਦੀਨ ਦੁਨੀ ਵਿਚ ਅਹਿਸਾਨ-ਫ਼ਰਾਮੋਸ਼ ਸਦਾਈਦਾ, ਜੋ ਧਰਤੀ ਦੀ ਸਭ ਤੋਂ ਨਕਾਰੀ ਸਮਾਜੀ ਨਸਲ ਹੈ। ਨਾਸ਼ੁਕਰੇ ਲੋਕਾਂ ਨੂੰ ਘਰ ਬਾਹਰ ਕੋਈ ਦੁਬਾਰਾ ਮੂੰਹ ਨਹੀਂ ਲਾਉਂਦਾ।

ਅੱਜ ਕੱਲ ਐਸੇ ਲੋਕ ਆਮ ਮਿਲ ਜਾਂਦੇ ਜਿਹੜੇ ਕਹਿਣਗੇ, "ਅਸੀਂ ਕੀ ਲਿਆ ਕਿਸੇ ਤੋਂ ? ਸਾਨੂੰ ਨਹੀਂ ਲੋੜ ਕਿਸੇ ਦੀ। ਸਭ ਕੁਛ ਹੈ ਸਾਡੇ ਕੋਲ, ਹੋਰ ਵੀ ਖੁਦ ਲੈ ਸਕਦੇ ਆਂ"। ਚੀਜ਼ਾਂ ਗਿਣਾਉਂਦਿਆਂ ਆਖਣਗੇ "ਆਹ ਮੈਂ ਬਣਾਇਆ ਜੋ ਵੀ ਹੈਗਾ"। ਐਸਾ ਕਹਿਣ ਵਾਲੇ ਆਮ ਕਰਕੇ ਹਉਮੈ ਦੇ ਮਾਰੇ ਅਗਿਆਨੀ ਲੋਕ ਹੁੰਦੇ।

ਸੋਚੋ, ਜਿਸ ਧਰਤੀ ਉੱਤੇ ਆਪਾਂ ਤੁਰੇ ਫਿਰਦੇ ਹਾਂ, ਜਿਸਤੋਂ ਸਭ ਕੁਝ ਲੈਂਦੇ ਹਾਂ ਖਾਧ ਖੁਰਾਕਾਂ ਹਵਾ ਪਾਣੀ, ਸਾਰਾ ਰੰਗ ਮੇਲਾ ਮਾਣ ਰਹੇ ਹਾਂ। ਜਿਹੜੀ ਧਰਤੀ ਨੇ ਸਾਡੇ ਵੱਡ ਵਡੇਰੇ ਤੇ ਸਾਨੂੰ ਪੈਦਾ ਕੀਤਾ, ਪਾਲਿਆ। ਕੀ ਇਹ ਧਰਤੀ ਆਪਾਂ ਬਣਾਈ ? ਜਿਸਨੇ ਵੀ ਇਹ ਧਰਤੀ,ਜੀਵ ਸੰਸਾਰ ਵਸਾਇਆ, ਕੀ ਅਸੀਂ ਉਸਦੇ ਪ੍ਰਤੀ ਸ਼ੁਕਰਾਨੇ ਵਜੋਂ ਮਨ ਹੀ ਮਨ ਸਿਰ ਝੁਕਾਉਂਦੇ ਹਾਂ ? ਕੀ ਇਸ ਧਰਤੀ ਦੀ ਹਵਾ ਪਾਣੀ ਮਿੱਟੀ ਦੀ ਵਡਿਆਈ ਸ਼ੁੱਧਤਾ ਨੂੰ ਮਨ ਵਿਚ ਉਹ ਜਗਾਹ ਦੇਂਦੇ ਹਾਂ, ਜਿਸਦੀ ਇਹ ਹੱਕਦਾਰ ਹੈ ? ਕੀ ਸਾਨੂੰ ਪਤਾ ਹੈ ਕਿ ਸਾਰੇ ਗਿਆਨ ਵਿਗਿਆਨ ਦੀ 'ਮਾਂ' ਧਰਤੀ ਹੈ, ਅਤੇ ਧਰਤੀ/ਕੁਦਰਤ ਦੇ ਸਹਿਜ ਨਿਯਮ ਹੀ ਸਮਾਜ ਅਤੇ ਵਿਗਿਆਨ ਦੇ ਗਿਆਨ ਦਾ ਆਧਾਰ/ਮੂਲ ਹਨ ?

ਕੀ ਸਾਨੂੰ ਪਤਾ ਹੈ ਕਿ ਸਭ ਰੰਗ ਰੂਪ ਆਕਾਰ ਸਵਾਦ, ਉਸ ਮਿੱਟੀ ਪਾਣੀ ਹਵਾ ਤੋਂ ਬਣੇ ਹਨ ਜਿਨ੍ਹਾਂ ਦਾ ਆਪਣਾ ਕੋਈ ਰੰਗ ਰੂਪ ਸਵਾਦ ਤੇ ਆਕਾਰ ਨਿਸ਼ਚਿਤ (ਫਿਕਸ) ਨਹੀਂ ? ਤੇ ਇਹ ਜਾਨਣ ਤੋਂ ਬਾਅਦ ਕੀ ਸਾਨੂੰ ਇਲਮ ਹੈ ਕਿ 'ਸਭ ਕੁਝ' ਉਹੀ ਇਨਸਾਨ ਬਣ ਸਕਦਾ, ਜਿਹੜਾ ਮਿੱਟੀ ਪਾਣੀ ਹਵਾ ਦੇ ਗੁਣਾਂ ਲੱਛਣਾਂ ਸੁਭਾਅ ਵਰਗਾ ਹੋਜੂ। ਜਿਵੇਂ ਕਿ ਸਾਂਝਾ ਬੇਗ਼ਰਜ਼ ਜਿਹਾ, ਆਪਣਾ ਪਿਆਰਾ ਜਿਹਾ, ਗੁਣੀ ਨਿਰਮਾਣ ਜਿਹਾ, ਹੱਦਾਂ ਤੋਂ ਪਾਰ ਜਿਹਾ, ਪਰਉਪਕਾਰ ਜਿਹਾ ? ਕੀ ਕੁਦਰਤ ਦੀਆਂ ਇਹਨਾਂ ਡੂੰਘੀਆਂ ਰਮਜ਼ਾਂ ਦੀ ਸੋਝੀ ਹੈ ਸਾਨੂੰ ? ਕੀ ਸਾਡੇ ਮਨ ਵਿਚੋਂ ਆਵਾਜ਼ ਆਉਂਦੀ ਹੈ ਕਿ "ਹੇ ਜਗਤ ਜਨਨੀ ਧਰਤੀ ਮਾਂ, ਅਸੀਂ ਜੋ ਵੀ ਹਾਂ, ਤੇਰੀ ਬਦੌਲਤ ਹੀ ਹਾਂ"?

ਕੀ ਅਸੀਂ ਸਮੁੱਚੀ ਧਰਤੀ ਨੂੰ 'ਮਾਂ' ਕਹਿੰਦੇ ਹਾਂ ਕਿ ਆਪਣੇ ਆਪਣੇ ਮੁਲਕਾਂ ਦੀ ਧਰਤੀ ਦੇ ਟੁਕੜੇ ਨੂੰ ? ਕੀ ਅਸੀਂ ਸਿਰਫ਼ ਆਪਣੇ ਧਰਤੀ ਟੁਕੜੇ ਦੀ ਜੈ ਜੈ ਕਾਰ ਦੇ ਨਾਹਰੇ ਲਾਉਂਦੇ ਹਾਂ ਕਿ ਸਾਰੀ ਧਰਤੀ ਮਾਂ ਦੇ ? ਕੀ ਅਸੀਂ ਧਰਤੀ ਨੂੰ ਐਟਮ ਬੰਬਾਂ ਨਾਲ ਸਾੜ ਕੇ ਸਵਾਹ ਕਰ ਦੇਣ ਦੀ ਯੋਗਤਾ/ਕਾਬਲੀਅਤ ਹਾਸਲਿ ਕਰਨ ਨੂੰ ਮਾਣਯੋਗ ਤਰੱਕੀ ਨਹੀਂ ਸਮਝਦੇ ? ਲਗਦਾ ਤਾਂ ਏਹੋ ਹੈ ਕਿ ਅਸੀਂ ਧਰਤੀ ਨੂੰ ਬੇਜਾਨ ਮਿੱਟੀ ਸਮਝਦੇ ਹਾਂ, ਆਪਣੇ ਵਰਤਣ ਵਾਲੀ ਸ਼ੈ। ਜਿੰਨੀ ਨੂੰ ਵਰਤਦੇਂ, ਉਹਨੂੰ ਆਖਨੇ ਮਾਂ, ਤੇ ਬਾਕੀ ਸਾਰੀ ਨੂੰ ਸਮਝਦੇ ਆਂ ਬਗਾਨੀ। 'ਮਾਂ' ਆਖਣਾ ਸਾਡਾ ਖੇਖਨ ਡਰਾਮਾ ਹੈ।

ਪਾਣੀ ਜੀਵਨ ਹੈ, ਪਰ ਬੰਦਾ ਧਰਤੀ ਦਾ ਪਾਣੀ ਅੰਦਰੋਂ ਚੂਸ ਜਾਣ ਲਈ ਉਤਾਰੂ ਹੈ, ਦਰਿਆਵਾਂ ਵਿਚ ਵੀ ਸਾਰਾ ਗੰਦ ਸੁੱਟੀ ਜਾ ਰਿਹਾ। ਇਸਦੇ ਸੁੰਦਰ ਸ਼ੁੱਧ ਦੈਵੀ ਰੂਪ ਦੀ ਸਾਨੂੰ ਉਵੇਂ ਕਦਰ ਨਹੀਂ, ਜਿਵੇਂ ਹੋਣੀ ਚਾਹੀਦੀ। ਸੂਰਜ ਚੰਦ ਤਾਰੇ ਬੱਦਲ ਹਵਾਵਾਂ ਅਜੇ ਲਾਲਚੀ ਬੰਦਿਆਂ ਦੇ ਜੱਫੇ ਵਿਚ ਨਹੀਂ ਆ ਰਹੇ। ਵੈਸੇ ਸੁਣੀਂਦਾ ਕਿ ਪ੍ਰਮਾਣੂ ਕਚਰਾ ਡੱਬਿਆਂ ਵਿਚ ਬੰਦ ਕਰਕੇ ਦੂਜੇ ਮਾੜੇ ਮੁਲਕਾਂ ਦੀ ਜੂਹ ਦੇ ਸਮੁੰਦਰਾਂ ਵਿਚ ਸੁੱਟਿਆ ਜਾ ਰਿਹਾ, ਪ੍ਰਮਾਣੂ ਤਾਕਤ ਦੇਸ਼ਾਂ ਵੱਲੋਂ। ਜਦੋਂ ਕਦੀ ਉਹ ਘੁਲੂ ਪਾਣੀ ਵਿਚ ਤਾਂ ਕੈਸੀ ਆਫ਼ਤ ਆਊ। ਇਸ ਵਿਨਾਸ਼ ਲੀਲਾ ਦੀ ਸਾਨੂੰ ਕੋਈ ਸੋਝੀ ਅਹਿਸਾਸ ਪੀੜਾ ਨਹੀਂ।

ਜਿੰਨੀਆਂ ਵੀ ਬੇਸ਼ੁਮਾਰ ਚੀਜ਼ਾਂ ਹਨ, ਜਿਸ ਸਾਜੋ ਸਾਮਾਨ ਨਾਲ ਸਾਰਾ ਘਰ ਉਸਰਿਆ, ਅਸੀਂ ਜੋ ਵੀ ਵਰਤਦੇ ਹਾਂ,

ਇਹਨਾਂ ਵਿਚੋਂ ਕੋਈ ਚੀਜ਼ ਵੀ ਅਸਾਂ ਬਣਾਈ ਜਾਂ ਬਣਾਉਣ ਦੇ ਕਾਬਿਲ ਹਾਂ ? ਨਹੀਂ। ਇਹ ਸਭ ਕਰਨ ਬਣਾਉਣ ਵਾਲੇ ਹੋਰ ਹਨ ਅਤੇ ਇਹ ਮਨੁੱਖ ਦੀ ਸਦੀਆਂ ਦੀ ਮਿਹਨਤ ਮੁਸ਼ੱਕਤ ਖੋਜ ਘਾਲਣਾ ਹੈ, ਜਿਸ ਵਿਚ ਸਾਡਾ ਯੋਗਦਾਨ ਮਮੂਲੀ ਹੈ। ਇਹ ਸਾਨੂੰ ਮਿਲੀ ਹੈ ਮਾਪਿਆਂ ਦੀ ਬਦੌਲਤ ਜਾਂ ਸਿਰਫ ਪੈਸਿਆਂ ਨਾਲ।

ਇਹ ਸਾਰੀ ਤਰੱਕੀ ਉਸਾਰੀ ਅਤੇ ਸਾਜੋ ਸਾਮਾਨ ਕਿੰਨ੍ਹਾਂ ਪਿਆਰੇ ਹੁਨਰਮੰਦ ਹੱਥਾਂ ਨੇ ਬਣਾਏ ? ਇਹਨਾਂ ਦੇ ਸਿਰਜਕ ਕਾਮਿਆਂ ਵਿਗਿਆਨੀਆਂ ਦਾ ਮਾਣ ਅਤੇ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਕਰਨਾ ਉਵੇਂ ਸਿੱਖੀਏ, ਜਿਵੇਂ ਕੋਈ ਕੁਦਰਤ ਦੀ ਸੁੰਦਰਤਾ ਵੇਖ ਕੇ ਕਹਿ ਉੱਠਦਾ ਹੈ, "ਹੇ ਸੁੰਦਰਤਾ, ਤੈਨੂੰ ਬਣਾਉਣ ਵਾਲਾ ਕਿੰਨਾ ਸੁੰਦਰ ਹੋਵੇਗਾ" !

ਸੁੰਦਰਤਾ ਉੱਤੇ ਮੋਹਿਤ ਹੁੰਦਿਆਂ, ਸਿਫ਼ਤ ਕਰਦਿਆਂ ਉਸਦੇ ਕਰਤਾ/ਬਣਾਉਣ ਵਾਲੇ ਨੂੰ ਮੁਹੱਬਤੀ ਆਦਰ ਵੀ ਦੇਣਾ ਬਣਦਾ। ਇਹ ਮਨ ਹੀ ਮਨ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਕਰਨਾ ਹੀ ਹੁੰਦਾ। ਕੀ ਆਪਾਂ ਕਰਦੇ ਆਂ ?

ਜਿਹੜਾ ਦੁੱਧ ਪੀਨੇ, ਨਿਆਣਿਆਂ ਨੂੰ ਪਿਆਉਨੇ, ਕੀ ਇਹ ਮੱਝਾਂ ਗਾਵਾਂ ਬੱਕਰੀਆਂ ਭੇਡਾਂ ਆਪਾਂ ਬਣਾਈਆਂ ? ਮਾਸਾਹਾਰੀ ਭੋਜਨ ਅਨਾਜ ਫਲ ਸਬਜੀਆਂ ਆਪਾਂ ਬਣਾਏ ? ਇਹ ਸਭ ਕੁਦਰਤ ਦੀ ਪੈਦਾਵਾਰ ਨਿਆਮਤਾਂ ਹਨ ਜੋ ਸਾਨੂੰ ਮਿਲੀਆਂ, ਪਰ ਇਹ ਬਖਸ਼ਿਸ਼ਾਂ ਵਜੋਂ ਸਾਨੂੰ ਚੇਤੇ ਨਹੀਂ ਰਹੀਆਂ।

ਜਿਨ੍ਹਾਂ ਮੱਝਾਂ ਗਾਵਾਂ ਦਾ ਹਜ਼ਾਰਾਂ ਸਾਲਾਂ ਤੋਂ ਸੰਗਲਾਂ ਨਾਲ ਬੰਨ੍ਹ ਕੇ ਦੁੱਧ ਚੋ ਰਹੇ ਆਂ, ਜਿਹੜੇ ਬੌਲਦਾਂ ਆਪਣੀਆਂ ਧੌਣਾਂ ਉਪਰ ਸਿਰਫ਼ ਸਾਡਾ ਭਾਰ ਢੋਇਆ, ਉਹਨਾਂ ਦੇ ਸ਼ੁਕਰਗੁਜ਼ਾਰ ਤਾਂ ਕੀ ਹੋਣਾ ਸੀ, ਅਸੀਂ ਤਾਂ ਉਮਰ ਭਰ ਉਹਨਾਂ ਨੂੰ ਉਹ ਗੁਲਾਮੀ ਦਿੱਤੀ ਜਿਹੜੀ ਸੋਚੀਏ ਤਾਂ ਰੂਹ ਕੰਬ ਜਾਏ। ਉਂਜ ਕਹਿਨੇ ਹਰ ਜੀਵ ਵਿਚ ਰੱਬ ਦਾ ਵਾਸਾ। ਕੀ ਰੱਬੀ ਰੂਹਾਂ ਨੂੰ ਗੁਲਾਮ ਬਣਾ ਕੇ, ਨੱਥ ਪਾ ਕੇ, ਸੰਗਲ ਮਾਰ ਕੇ ਕਿੱਲਿਆਂ ਤੇ ਬੱਧਾ ਆਪਾਂ ? ਉਂਜ ਆਪਣੇ ਲਈ ਅਜ਼ਾਦੀ ਚਹੁਨੇ।

ਬੱਚਿਆਂ ਨੂੰ ਆਪਣੀ ਔਲਾਦ ਪੈਦਾ ਕਰਕੇ ਹੀ ਪਤਾ ਲਗਦਾ ਹੈ ਕਿ ਸਾਡੇ ਮਾਪਿਆਂ ਨੇ ਵੀ ਸਾਨੂੰ ਕਿਵੇਂ ਔਖਿਆਂ ਹੋ ਕੇ ਜੰਮਿਆਂ ਪਾਲਿਆ ਹੋਊਗਾ। ਇਸਦਾ ਗਿਆਨ ਤਾਂ ਹੋ ਜਾਂਦਾ, ਪਰ ਬਹੁਤਿਆਂ ਨੂੰ ਅਹਿਸਾਸ ਨਹੀਂ। ਪੂਰਾ ਅਹਿਸਾਸ ਹੋ ਜਾਵੇ ਤਾਂ ਉਹ ਮਾਪਿਆਂ ਦੇ ਚਰਨਾਂ ਵਿਚ ਡਿੱਗ ਪੈਣ। ਕਹਿਣ "ਓ ਮੇਰੀ ਮਾਏਂ! ਤੂੰ ਨੌਂ ਮਹੀਨੇ ਮੈਨੂੰ ਆਪਣੇ ਸਰੀਰ ਵਿਚ ਇਹ ਸ਼ਾਨਦਾਰ ਵਜੂਦ ਦਿੱਤਾ, ਤੇ ਫਿਰ ਮਰ ਮਰ ਕੇ ਜਨਮ ਦਿੱਤਾ, ਇੰਜ ਰਾਤਾਂ ਜਾਗ ਜਾਗ ਮੈਨੂੰ ਪਾਲਿਆ, ਕਦੀ ਆਪਣਾ ਸੁਖ ਨਾ ਵੇਖਿਆ। ਬਾਪੂ ਤੂੰ ਮੇਰੀ ਖਾਤਰ ਏਨਾ ਪਸੀਨਾ ਵਹਾਇਆ, ਕਮਾਇਆ। ਤੁਸਾਂ ਲਾਡ ਲਡਾਇਆ। ਪੜ੍ਹਾਇਆ, ਇਸ ਕਾਬਲ ਬਣਾਇਆ। ਤੁਸੀਂ ਸਾਨੂੰ ਉਂਗਲੀ ਫੜ੍ਹਕੇ ਤੁਰਨਾ ਸਿਖਾਇਆ, ਅਸੀਂ ਕਦੀ ਵੀ ਤੁਹਾਡੀ ਬਾਂਹ ਨਹੀਂ ਛੱਡਾਂਗੇ । ਜਦੋਂ ਤੁਹਾਨੂੰ ਤੁਰਨਾ ਔਖਾ ਲੱਗਿਆ, ਅਸੀਂ ਤੁਹਾਡੀ ਡੰਗੋਰੀ ਬਣ ਜਾਵਾਂਗੇ"। ਪਰ ਜੋ ਅਸਲ ਸੱਚਾਈ ਸਾਡੇ ਸਾਹਮਣੇ ਚੱਲ ਰਹੀ, ਉਸਨੂੰ ਲਿਖਣ ਲੱਗਿਆਂ ਮੇਰੇ ਹੱਥ ਕੰਬਦੇ ਹਨ। ਜਿਨ੍ਹੇ ਮਾਪਿਆਂ ਦਾ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਨਾ ਕੀਤਾ, ਉਹ ਹੋਰ ਕਿਤੇ ਵੀ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਕਰਨ ਦੇ ਕਾਬਲ ਨਹੀਂ ?

ਵੇਖੋ ਬੱਚੇ ਦਾ ਸਕੂਲੇ ਜਾਣ ਦਾ ਪਹਿਲਾ ਦਿਨ। ਨਵੀਂ ਵਰਦੀ ਨਵਾਂ ਬਸਤਾ। ਬੱਚਾ ਅੰਮੀ ਪਾਪਾ ਨਾਲ ਨੱਚਦਾ ਸਕੂਲੇ ਗਿਆ। ਜਦ ਛੱਡ ਕੇ ਮੁੜਨ ਲੱਗੇ ਤਾਂ ਨਿਆਣੇ ਚੰਗਿਆੜਾਂ ਮਾਰੀਆਂ, ਉਹਨਾਂ ਦੀਆਂ ਲੱਤਾਂ ਨੂੰ ਚਿੰਬੜ ਗਿਆ, ਆਖੇ ਮੈਂ ਨੀ ਇਥੇ ਰੁਕਣਾ। ਅਧਿਆਪਕਾਂ ਪਿਆਰ ਨਾਲ ਗੋਦੀ ਚੁੱਕਿਆ ਬਿਠਾਇਆ ਚੁੱਪ ਕਰਾਇਆ। ਕਈ ਦਿਨ ਏਹੋ ਰੋਣ ਕਲੌਣ ਚਲਦਾ ਰਿਹਾ । ਅਧਿਆਪਕਾਂ/ਉਸਤਾਦਾਂ ਹੌਲੀ ਹੌਲੀ ਸਕੂਲ ਨਾਲ ਜੋੜਿਆ। ਮਾਪਿਆਂ ਨਾਲ ਮਿਲ ਕੇ ਗਿਆਨ ਦੀ ਨੀਂਹ ਭਰੀ। ਖੰਭ ਲਾਏ। ਉੱਚ ਵਿਦਿਆ ਨੇ ਭੱਜਣਾ ਉੱਡਣਾ ਸਿਖਾਇਆ। ਜਿੰਨੇ ਵੀ ਵੱਡੇ ਵੱਡੇ ਅਫ਼ਸਰ ਕਾਰੋਬਾਰੀ ਲੀਡਰ ਖੋਜੀ ਬੁੱਧੀਜੀਵੀ/ਦਾਨਸ਼ਿਵਰ ਛਾ ਰਹੇ ਨੇ, ਸਭ ਅਧਿਆਪਕਾਂ ਵਿਦਿਆ ਦੀ ਬਦੌਲਤ ਹੀ ਹਨ। ਧਰਤੀ ਮਾਪਿਆਂ ਤੋਂ ਬਾਅਦ ਇਹ ਅਧਿਆਪਕ/ਉਸਤਾਦ ਹਨ, ਜਿਨ੍ਹਾਂ ਦਾ 'ਦੇਣ' ਦਿੱਤਾ ਹੀ ਨਹੀਂ ਜਾ ਸਕਦਾ।

ਵਿਦਿਅਕ/ਪੜ੍ਹਾਈ ਕਰਾਉਣ ਵਾਲੇ ਅਦਾਰੇ ਕੋਈ ਆਮ ਦੁਕਾਨ ਨਹੀਂ, ਕਿਸੇ ਕਾਰੋਬਾਰੀ ਲਈ ਵਿਦਿਆ ਵਪਾਰ

ਵਰਗੀ ਹੁੰਦੀ ਵੀ ਹੋਊਗੀ, ਪਰ ਵਦਿਆਿਰਥੀ ਅਧਆਿਪਕ (ਸਟੂਡੈਂਟ ਟੀਚਰ) ਲਈ ਨਹੀਂ ਹੋਣੀ ਚਾਹੀਦੀ। ਅਧਆਿਪਕ ਵਦਿਆਿਰਥੀਆਂ ਉੱਤੋਂ ਆਪਣੀ ਸਾਰੀ ਲਆਿਕਤ ਨਛਿਾਵਰ ਕਰਨ ਵਾਲਾ ਹੋਣਾ ਚਾਹੀਦਾ, ਤੇ ਵਦਿਆਿਰਥੀ ਹਮੇਸ਼ਾਂ ਇਸ ਦੀ ਸੁਕਰਾਨੇ ਵਰਗੀ ਕਦਰ ਕਰਨ ਵਾਲਾ। ਕਾਬਲ ਇਨਸਾਨ ਦੀ ਸਰਿਜਣਾ ਕਰਨੀ ਸਭ ਤੋਂ ਉੱਤਮ ਕਰਮ ਹੈ, ਜੋ ਅਧਆਿਪਕ ਕਰਦਾ। ਗਆਿਨ ਦੇਣਾ ਕਸਿੇ ਉੱਤੇ ਸਭ ਤੋਂ ਵੱਡਾ ਉਪਕਾਰ ਹੈ। ਕੀ ਗਆਿਨ ਲੈਣ ਦੇਣ ਵਾਲਆਿਂ ਨੂੰ ਇਸਦਾ ਅਹਸਿਾਸ ਹੈ ?

ਜਦ ਕੋਈ ਸਾਡਾ ਨੱਕਿਾ ਜਹਿਾ ਕੰਮ ਕਰ ਦੇਵੇ, ਏਥੋਂ ਤਕ ਕਿ ਸਾਡੇ ਹੱਥੋਂ ਜ਼ਮੀਨ ਉੱਤੇ ਡੱਗਿੀ ਚੀਜ਼ ਚੁੱਕ ਕੇ ਫੜਾ ਦੇਵੇ ਤਾਂ ਅਸੀਂ ਉਸਦਾ ਸੁਕਰਾਨਾ ਕਰਨਾ ਨਹੀਂ ਭੁੱਲਦੇ। ਜੇ ਸੁਕਰੀਆ ਨਾ ਆਖੀਏ ਤਾਂ ਅਗਲਾ ਸੋਚਦਾ ਕਿ ਬੰਦਾ ਇਹ ਨਾਸੁਕਰਾ ਜਹਿਾ ਈ ਸੀ। ਲੇਕਨਿ ਜੇ ਕਸਿੇ ਉੱਤੇ ਕੋਈ ਵੱਡਾ ਉਪਕਾਰ ਕਰੇ ਪਰ ਅਗਲਾ ਗੁਣ ਨਾ ਜਾਣੇ ਤਾਂ ਸਾਰੇ ਲੋਕ ਹੀ ਆਖਣ ਲੱਗ ਪੈਂਦੇ ਹਨ "ਉਏ ਜਹਿੜਾ ਉਹਦਾ ਨਹੀਂ ਬਣਆਿਂ ਜਨਿ੍ਹੇ ਏਨਾ ਕੀਤਾ, ਇਹ ਹੋਰ ਕਸਿੇ ਦਾ ਨੀ ਬਣ ਸਕਦਾ, ਦੂਰ ਈ ਰਹੋ ਇਹਦੇ ਤੋਂ"। । ਨਾਸੁਕਰਾਪਨ ਬੰਦੇ ਨੂੰ ਅਰਸ਼ ਤੋਂ ਫਰਸ਼ ਉੱਤੇ ਲਆਿ ਸੁੱਟਦਾ।

ਨਾਸੁਕਰੇ ਬੰਦੇ ਦਾ ਤਾਂ ਹਾਸਾ ਵੀ ਇਸ ਤਰਾਂ ਦਾ ਹੁੰਦਾ ਹੈ ਜਵਿੇਂ ਉਹ ਦੂਜਆਿਂ ਨੂੰ ਬੇਵਕੂਫ ਬਣਾ ਰਹਿਾ ਹੋਵੇ। ਉਹ ਚਾਲਾਕ ਹੁੰਦਾ ਹੈ, ਸਆਿਣਾ ਨਹੀਂ। ਉਹ ਇਕ ਦੋ ਵਾਰ ਆਪਣਾ ਕੰਮ ਕਢਵਾਉਣ ਵਰਗਾ ਉੱਲੂ ਤਾਂ ਸੱਧਿਾ ਕਰ ਸਕਦਾ ਹੈ, ਪਰ ਅਪਣੱਤ ਦੇ ਅਹਸਿਾਸ ਪੱਖੋਂ ਨੰਗ ਹੁੰਦਾ ਹੈ। ਘੋਰ ਨੱਜਿ ਸਵਾਰਥੀ (ਸੈਲਫਸਿ਼) ਬੰਦਾ ਚੰਗਾ ਇਨਸਾਨ ਨਹੀਂ ਬਣ ਸਕਦਾ।

ਮੈਂ 1985 ਵਚਿ ਮਾਸਕੋ ਵਚਿ ਹੋਏ ਬਾਰ੍ਹਵੇਂ ਅੰਤਰਰਾਸ਼ਟਰੀ ਯੁਵਕ ਮੇਲੇ ਦਾ ਡੈਲੀਗੇਟ ਸਾਂ। ਜਦ ਜਾਣ ਲੱਗਾ ਤਾਂ ਮਾਸਕੋ ਵਚਿ ਕਈ ਸਾਲ ਰੂਸੀ ਸਾਹਤਿ ਦਾ ਪੰਜਾਬੀ ਵਚਿ ਸ਼ਾਨਦਾਰ ਅਨੁਵਾਦ ਕਰਕੇ ਵਾਪਸ ਗੁਰੂ ਨਾਨਕ ਯੂਨੀਵਰਸਟਿੀ ਆਏ ਮੇਰੇ ਅਧਆਿਪਕ ਡਾ. ਗੁਰਬਖਸ਼ ਫਰੈਂਕ ਜੀ ਨੇ ਮੈਨੂੰ ਸੱਖਿ ਮੱਤ ਦੱਤਿੀ ਕਿ" ਉਥੇ ਘੱਟੋ ਘੱਟ ਦੋ ਸ਼ਬਦ ਜ਼ਰੂਰ ਯਾਦ ਰੱਖੀਂ। ਇਕ 'ਜਦਰਾਸਤ ਵੁਈ ਚੇ', ਇਸਨੂੰ ਕਸਿੇ ਨੂੰ ਬੁਲਾਉਣ ਲੱਗਆਿਂ ਦੁਆ ਸਲਾਮ ਕਰਨਾ ਈ ਸਮਝ। ਅਤੇ ਦੂਜਾ 'ਸਪਾਸਬਿਾ', ਇਸਦਾ ਮਤਲਬ ਸੁਕਰੀਆ। ਰੂਸੀ ਲੋਕ ਸੁਕਰੀਆ ਨਾ ਕਹਣਿ ਵਾਲੇ ਨੂੰ ਉਜੱਡ ਸਮਝਦੇ ਨੇ"। ਮੇਰੇ ਉਥੇ ਇਹ ਗੁਰ ਬੜਾ ਕੰਮ ਆਇਆ। ਇਕ ਸ਼ਬਦ ਨਾਲ ਹੀ ਮੈਂ ਬਗਾਨੇ ਮੁਲਕ ਵਚਿ ਸਲੀਕੇ ਵਾਲਾ ਇਨਸਾਨ ਬਣ ਗਆਿ। ਜ਼ਰਾ ਸੋਚੋ ਕਿ ਜੇ ਸੁਕਰਾਨੇ ਨੂੰ ਜੀਵਨ ਕਰਮ ਹੀ ਬਣਾ ਲਈਏ ਤਾਂ ਕੱਨਿਾ ਚੰਗਾ ਹੋਵੇ।

ਸੁਕਰਾਨਾ ਦਲਿੋਂ ਹੁੰਦਾ, ਇਹ ਮਹਜਿ਼ ਸ਼ਬਦ ਨਹੀਂ ਹੁੰਦੇ, ਸਗੋਂ ਸੁਕਰਾਨਾ ਕਰਦਆਿਂ ਬਹੁਤੀ ਵਾਰ ਸ਼ਬਦ ਘੱਟ ਬੋਲਦੇ ਤੇ ਨਜ਼ਰਾਂ ਵੱਧ ਕਹਿ ਰਹੀਆਂ ਹੁੰਦੀਆਂ ਹਨ, ਜਸਿ ਲਈ ਸ਼ਬਦ ਨਹੀਂ ਮਲਿ ਰਹੇ ਹੁੰਦੇ। ਮਨੋ ਸੁਕਰਾਨਾ ਜੋ ਨਜ਼ਰਾਂ ਰਾਹੀਂ ਬਨਿ ਬੋਲਆਿਂ ਕੀਤਾ ਜਾਂਦਾ, ਇਸ ਨੂੰ ਵੇਖਣ ਵਾਲੀ ਅੱਖ ਵੀ ਚਾਹੀਦੀ। ਸੁਕਰਾਨਾ ਸ਼ਬਦਾਂ ਦਾ ਮੁਹਤਾਜ ਨਹੀਂ।

ਜੀਵ ਪੰਛੀ ਰੁੱਖ ਬੂਟੇ ਸੁਕਰਾਨੇ ਅਤੇ ਪਆਿਰ ਦੇ ਸਹਜਿ ਅਰਥ ਜਾਣਦੇ ਅਤੇ ਮਾਣਦੇ ਹਨ, ਕਉਿਂਕਿ ਉਹ ਕੁਦਰਤ ਦੇ ਅਸਲੀ ਲਾਡਲੇ ਵਫ਼ਾਦਾਰ ਪਆਿਰੇ ਧੀਆਂ ਪੁੱਤ ਹਨ। ਉਹਨਾਂ ਦੇ ਆਪਸੀ ਲੈਣ ਦੇਣ ਮੇਲ ਜੋਲ ਵਚਿ ਕਦੀ ਖੋਟ ਨਹੀਂ ਦੱਸਿੀ। ਸਾਨੂੰ ਅੱਜ ਤਕ ਕੋਈ ਐਸਾ ਜੀਵ ਪੰਛੀ ਜ਼ਮੀਨ ਰੁੱਖ ਬੂਟਾ ਨਹੀਂ ਮਲਿਆਿ, ਜੋ ਸਾਡੇ ਪ੍ਰਤੀ ਨਾਸੁਕਰਾ ਲੱਗੇ। ਕਉਿਂਕਿ ਉਹਨਾਂ ਦਾ ਮੂੰਹ ਕੁਦਰਤ ਵੱਲ ਹੈ।

ਇੰਜ ਸੁਕਰਾਨਾ ਕਸਿੇ ਬੰਦੇ ਦੀ ਕਾਢ ਜਾਂ ਨਵਾਂ ਦੱਸਆਿ ਸਧਿਾਂਤ ਨਹੀਂ, ਕੁਦਰਤ ਦਾ ਬਆਿਨ ਹੈ, ਕੁਦਰਤ ਦਾ ਰੂਪ ਹੋ ਜਾਣ ਵਰਗਾ ਹੈ। ਅਸਾਂ ਧਰਤੀ ਉੱਤੇ ਅਤੇ ਸਮਾਜ ਵਚਿ ਕਵਿੇਂ ਰਹਣਿਾ ਤੇ ਜੀਣਾ ਹੈ, ਇਸਦਾ ਮੁਢਲਾ ਸਬਕ ਸੁਕਰਾਨੇ ਦਾ ਸਹਜਿ ਗਆਿਨ ਹੈ। ਜੋ ਬਾਕੀ ਸਾਰੀ ਕਾਇਨਾਤ ਨੂੰ ਤਾਂ ਯਾਦ ਹੈ ਧੁਰੋਂ, ਪਰ ਕੁਦਰਤ ਵੱਲ ਪੱਠਿ ਕਰਨ ਕਰਕੇ ਸਾਨੂੰ ਭੁੱਲ ਭੁਲਾ ਗਆਿ ਹੈ ਅਤੇ ਦੱਸਣ ਦੀ ਲੋੜ ਪੈ ਰਹੀ ਹੈ।

ਅਸਲ ਵਿਚ ਧਰਤੀ ਦੇ ਕੁੱਲ ਇਨਸਾਨਾਂ ਦਾ ਸਾਰਾ ਗਿਆਨ ਵਗਿਆਿਨ ਵਖਿਆਨ ਕੁਦਰਤ ਦੀ ਸਮਝ ਅਤੇ ਬਆਿਨ ਹੀ ਹੈ। ਪੜ੍ਹਾਈਆਂ ਲਖਿਾਈਆਂ, ਕੁਦਰਤ ਅਤੇ ਆਪਣੀ ਪ੍ਰਕਰਿਤੀ/ਹਸਤੀ ਨੂੰ ਸਮਝਣ ਦਾ ਰਆਿਜ਼ ਹਨ। ਚੀਜ਼ਾਂ ਵਸਤਾਂ 'ਤੱਤਾਂ' (ਬੇਸਕਿ ਕੁਦਰਤੀ ਐਲੀਮੈਂਟਸ) ਦੇ ਜੋੜ ਮੇਲੇ ਹਨ। 'ਦੇਸ਼ ਕਾਨੂੰਨ' ਕਾਬਜਾਂ ਦੇ ਆਪਣੇ ਹੱਿਤ/ਫਾਇਦੇ ਲਈ ਬਣਾਏ ਖੇਲ ਹਨ ਕੁਦਰਤੀ ਸੋਚ ਹੀ ਇਨਸਾਨੀ ਸਮਾਜ/ਦੇਸ਼ਾਂ ਨੂੰ ਇਸ ਖੇਲ 'ਚੋਂ ਕੱਢ ਸਕਦੀ। ਪਰ ਇਸ ਵਚਿ ਨਾਸ਼ੁਕਰੇਪਨ ਲਈ ਕੋਈ ਜਗਾਹ ਨਹੀਂ।

ਮੁਲਕਾਂ ਵੱਲੋਂ ਵੇਖੋ ਵੇਖੀ ਧਰਤੀ ਨੂੰ ਮੁਕੰਮਲ ਤੌਰ ਉੱਤੇ ਤਬਾਹ ਕਰਨ ਦੇ ਹਥਆਿਰ ਤਆਿਰ ਕਰਨੇ ਇਨਸਾਨ ਦੇ ਧਰਤੀ/ਕੁਦਰਤ/ਰੱਬ ਪ੍ਰਤੀ ਘੋਰ ਨਾਸ਼ੁਕਰੇਪਨ ਦੀ ਅਲਾਮਤ ਹੈ। ਇਹ ਬੰਦੇ ਦਾ 'ਧਰਤੀ ਮਾਂ' ਨਾਲ ਧ੍ਰੋਹ ਹੈ। ਸਵਾਰਥ ਮੂਰਖਤਾ ਅਤੇ ਨਾਸ਼ੁਕਰੇਪਨ ਦੀ ਇੰਤਹਾ ਹੈ। 'ਧਰਤੀ ਦੇ ਕਣ ਕਣ ਵਚਿ ਰੱਬ ਵੱਸਦਾ' ਪਰਚਾਰਨ ਵਾਲੇ ਧਰਮਾਂ/ਮਜ਼੍ਹਬਾਂ ਵਚਿੋਂ ਕੋਈ ਵੀ ਨਹੀਂ ਬੋਲਦਾ ਕਿ ਧਰਤੀ ਨੂੰ ਫ਼ਨਾਹ ਕਰਨ ਵਾਲੇ ਹਥਆਿਰ ਬਣਾਉਣੇ ਗੁਨਾਹ ਹੈ।

ਇਹ ਕੌੜਾ ਸੱਚ ਹੈ ਕਿ ਮਨੁੱਖ ਕੁਦਰਤ ਦੀ ਨੇਕ ਔਲਾਦ ਸਾਬਤ ਨਹੀਂ ਹੋਇਆ।

ਸ਼ੁਕਰਾਨੇ ਦਾ ਪਹਲਿਾ ਪਾਠ ਬੱਚਾ ਘਰੋਂ ਪੜ੍ਹਦਾ। ਜੇ ਮਾਪੇ ਨਾਸ਼ੁਕਰੇ ਹਨ ਤਾਂ ਬੱਚਾ ਰੋਜ਼ ਵੇਂਹਦਾ। ਕਈ ਮਾਪੇ ਤਾਂ ਖੁਦ ਸਖਿਾਉਂਦੇ ਕਿ ਲੋਕਾਂ ਨੂੰ ਇੰਜ ਵਰਤ ਕੇ ਚੂਪੇ ਅੰਬ ਵਾਂਗ ਪਰ੍ਹਾਂ ਸੁੱਟੀਦਾ ਹੁੰਦਾ। ਮਾਸੂਮ ਬੱਚੇ ਦੇ ਕੁਦਰਤੀ ਵਚਿਾਰ ਡੋਲ ਜਾਂਦੇ। ਫਰਿ ਖਰਬੂਜੇ ਵੱਲ ਵੇਖ ਕੇ ਖਰਬੂਜਾ ਰੰਗ ਫੜ੍ਹਦਾ। ਉਹ ਵੀ ਮਾਪਆਿਂ ਵਰਗਾ ਲੱਗਣ ਲਗਦਾ। ਆਪਣਾ ਬੱਚਾ ਨਾਸ਼ੁਕਰਾ ਬਣਾਉਣਾ ਉਸ ਅੰਦਰਲੀ ਇਨਸਾਨੀਅਤ ਮਾਰ ਦੇਣ ਦੇ ਤੁੱਲ ਹੈ।

ਪਰ ਕੁਦਰਤ ਵੀ ਬੜੀ ਬੇਅੰਤ। ਬਹੁਤ ਉਦਾਹਰਣਾਂ ਕਿ ਮਗਰੋਂ ਬੱਚੇ ਮਾਪਆਿਂ ਦੇ ਨਾਸ਼ੁਕਰੇਪਨ ਵਾਲੇ ਸੁਭਾਅ ਨੂੰ ਫਟਿਕਾਰ ਵੀ ਪਾਉਂਦੇ ਵੇਖੀਦੇ। ਕਹੰਿਦੇ "ਜਾਓ ਪਰ੍ਹਾਂ, ਧਾਡੇ ਨਾਸ਼ੁਕਰੇ ਸੁਭਾਅ ਕਰਕੇ ਹੁਣ ਸਾਨੂੰ ਭੁਗਤਣਾ ਪੈ ਰਹਿਾ"।

ਇਹ ਵੇਖਆਿ ਗਆਿ ਹੈ ਕਿ ਗਰੀਬ ਬੰਦੇ ਵੱਲੋਂ ਕੀਤੇ ਕਸਿੇ ਵੀ ਉਪਕਾਰ ਲਈ ਅਮੀਰ ਲੋਕ ਉਵੇਂ ਖੁੱਲ ਕੇ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਨਹੀਂ ਕਰਦੇ, ਜਸਿਦਾ ਉਹ ਹੱਕਦਾਰ ਹੁੰਦਾ। ਬਸ ਮੂੰਹ ਜਹਿਾ ਬਣਾ ਕੇ ਪਛਿਾਂਹ ਮੁੜਦੇ ਮੁੜਦੇ ਏਨਾ ਆਖਣਗੇ, "ਕਦੀ ਕਦੀ ਮਾਰ ਜਆਿ ਕਰ ਇਵੇਂ ਗੇੜਾ"।

ਕਸਿੇ ਲਈ ਕੀਤਾ ਨਰਿਸਵਾਰਥ ਕਰਮ ਹੀ ਅਗਲੇ ਦੇ ਮਨ ਵਚਿ ਸ਼ੁਕਰਾਨੇ ਦੀਆਂ ਤਰੰਗਾਂ ਛੇੜਦਾ ਹੈ, ਗਣਿਆਿਂ ਮਥਿਆਿ ਲੈਣ ਦੇਣ ਨਹੀਂ। ਦੂਜੇ ਦੀ ਚਾਹਤ ਨੂੰ ਸੰਤੁਸ਼ਟ ਕਰਨ ਨਾਲ ਉਸਦੇ ਅੰਦਰ ਆਪਮੁਹਾਰੇ ਸ਼ੁਕਰਾਨੇ ਦੀਆਂ ਲਹਰਿਾਂ ਉੱਠਦੀਆਂ ਹਨ। ਆਪਣਆਿਂ ਦੋਸਤਾਂ ਅਤੇ ਰਸਿ਼ਤਆਿਂ ਵਚਿ ਠੰਡਾ ਮੱਿਠਾ ਹਾਸਾ ਠੱਠਾ ਵੀ ਇਕ ਤਰਾਂ ਅਗਲੇ ਨਾਲ ਨੱਿਘੇ ਰਸਿ਼ਤੇ ਦਾ ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ ਕਰਨਾ ਹੀ ਹੁੰਦਾ ਹੈ।

'ਸ਼ੁਕਰਾਨਾ' ਆਪਣੇਪਨ ਦੀ ਮਾਂ ਹੈ, ਇਹ ਜੀਵਨ ਬੂਟੇ ਲਈ ਪਾਣੀ ਹੈ, ਇਹ ਸ਼ਖ਼ਸੀਅਤ ਦਾ ਗਹਣਿਾ ਹੈ, ਇਹ ਰਸਿ਼ਤਆਿਂ ਦੀ ਗੁੰਦ ਹੈ, ਇਹ ਨਰਿਮਾਣਤਾ ਦੀ ਨੀਂਹ ਹੈ, ਇਹ ਪਆਿਰ ਦਾ ਇਜ਼ਹਾਰ ਹੈ, ਇਹ ਸੁੱਚਾ ਰੂਹਾਨੀ ਵਪਾਰ ਹੈ, ਇਹ ਭਗਤੀ ਦਾ ਆਧਾਰ ਹੈ, ਇਹੀ ਸ਼ੁੱਧ ਇਨਸਾਨੀ ਵਰਤੋਂ ਵਹਿਾਰ ਹੈ। ਇਹੀ ਸ੍ਰਸ਼ਿਟੀ/ਕਾਇਨਾਤ ਦੇ ਰਚੇਤਾ ਨੂੰ ਦਲਿੀ ਨਮਸਕਾਰ/ਆਦਾਬ ਹੈ।

148, ਸੁੰਦਰ ਵਹਿਾਰ, ਤਲਵਾੜਾ (ਹੁਸ਼ਆਿਰਪੁਰ)

CULTURE & LIBERAL ARTS

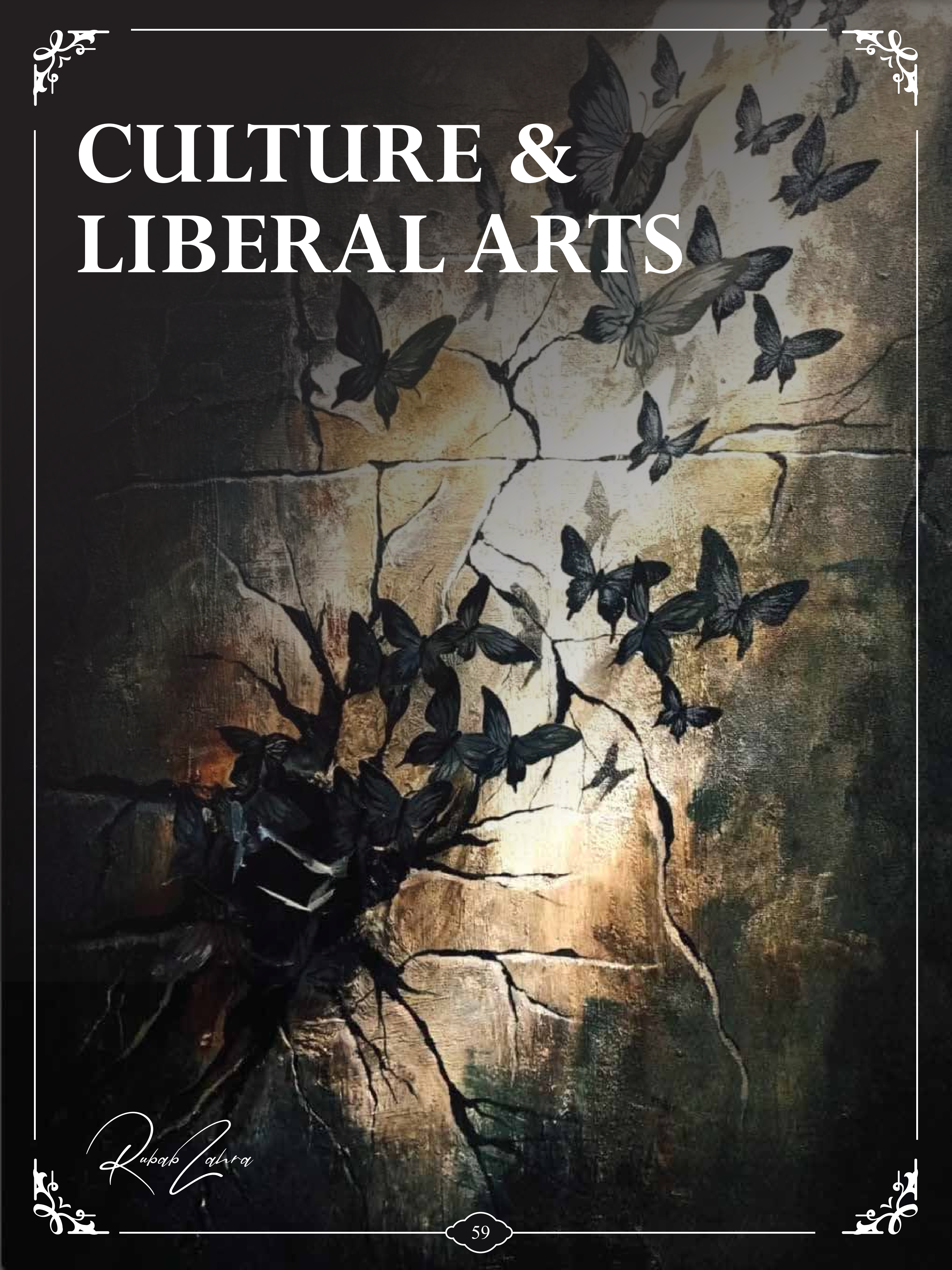

Sania

Asif

Sania

Asif
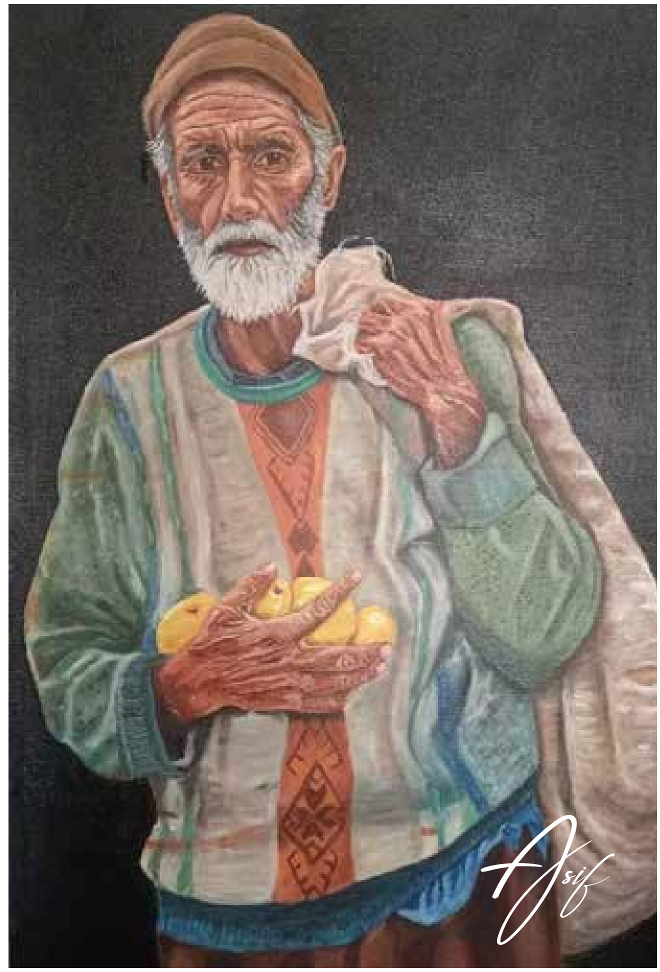
Asif

Asif

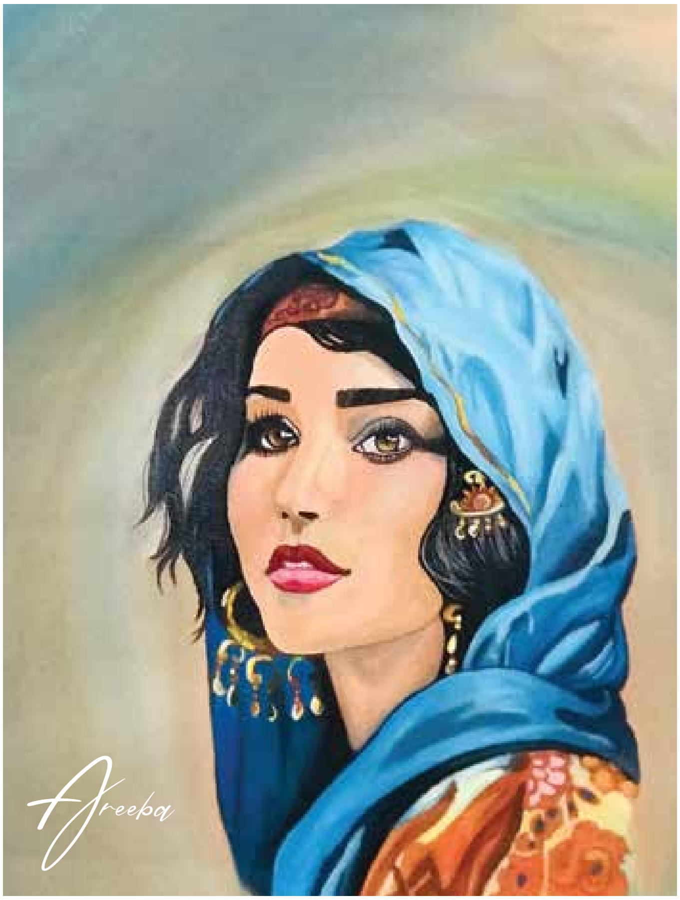
Areeba

Areeba

Areeba

Amna

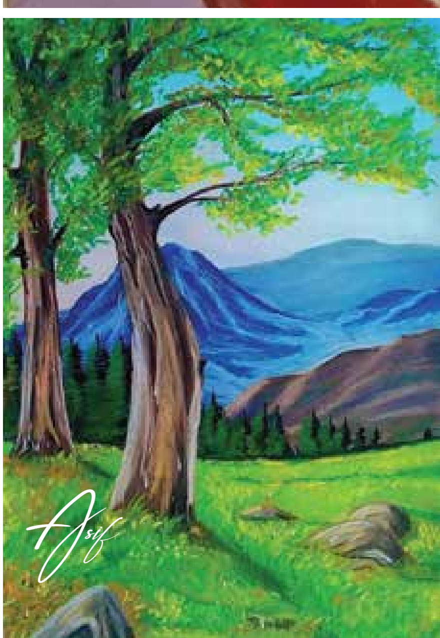
Asif

Bano

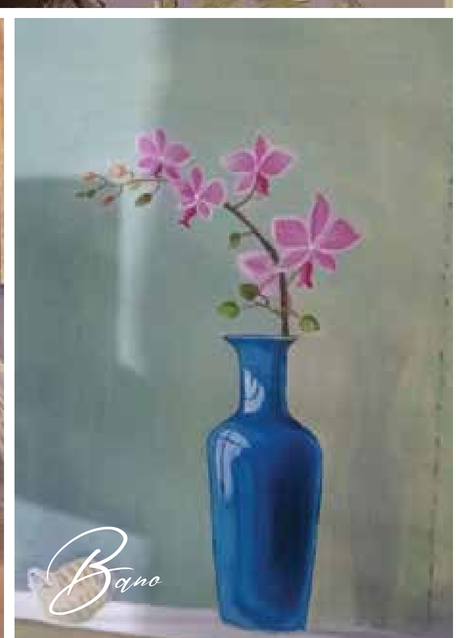
Bano

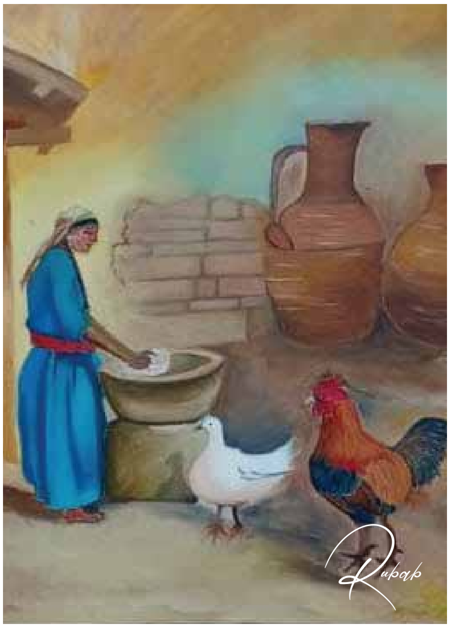

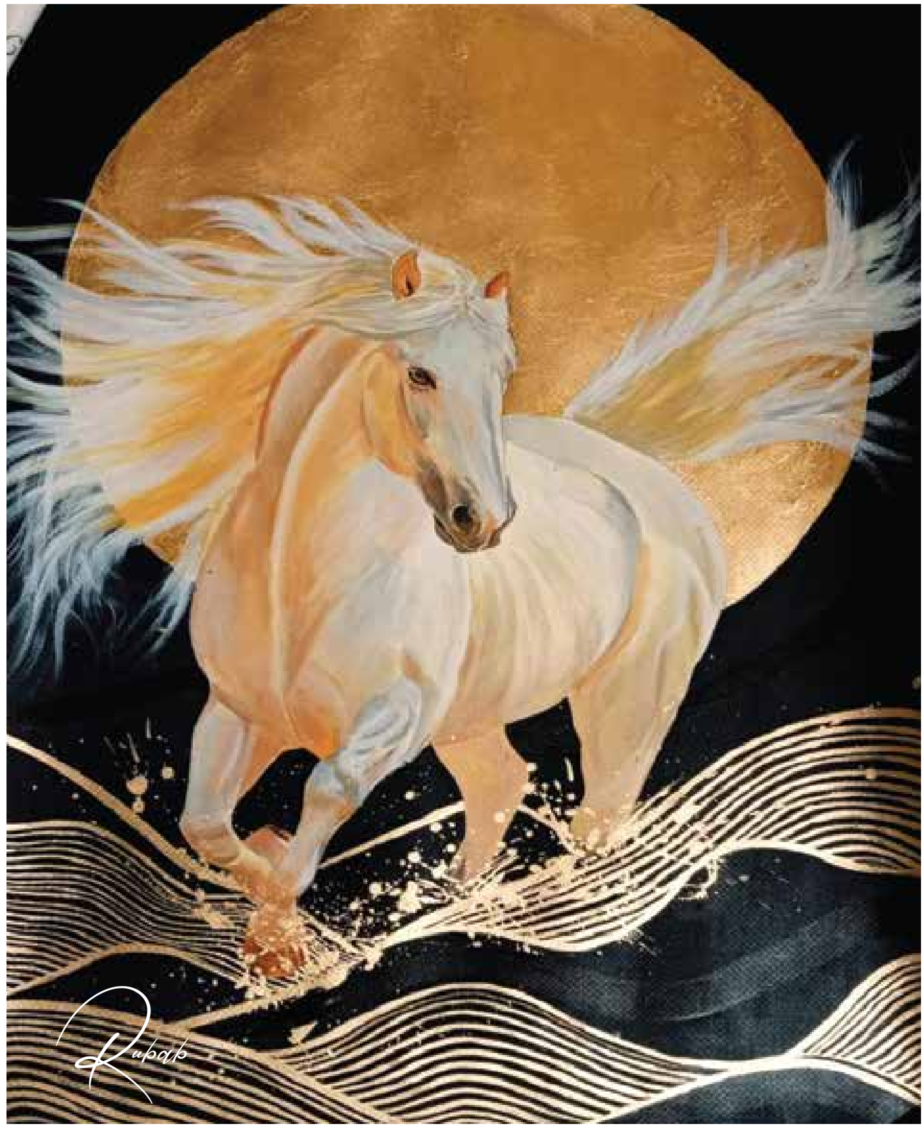

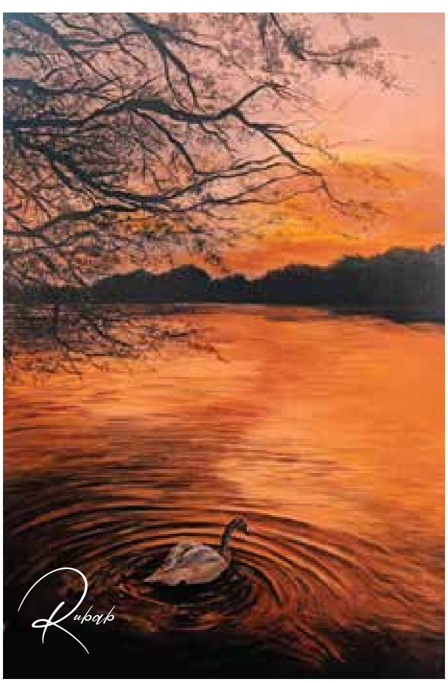

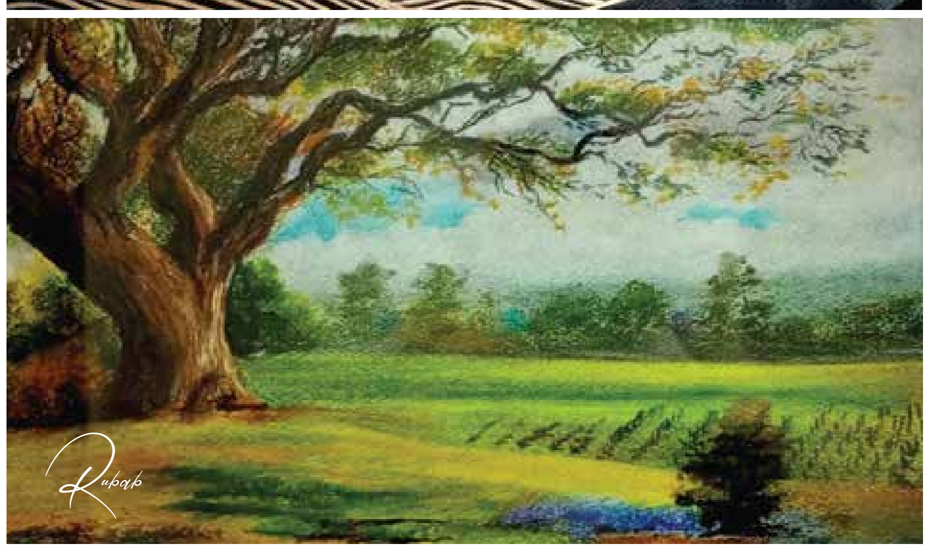

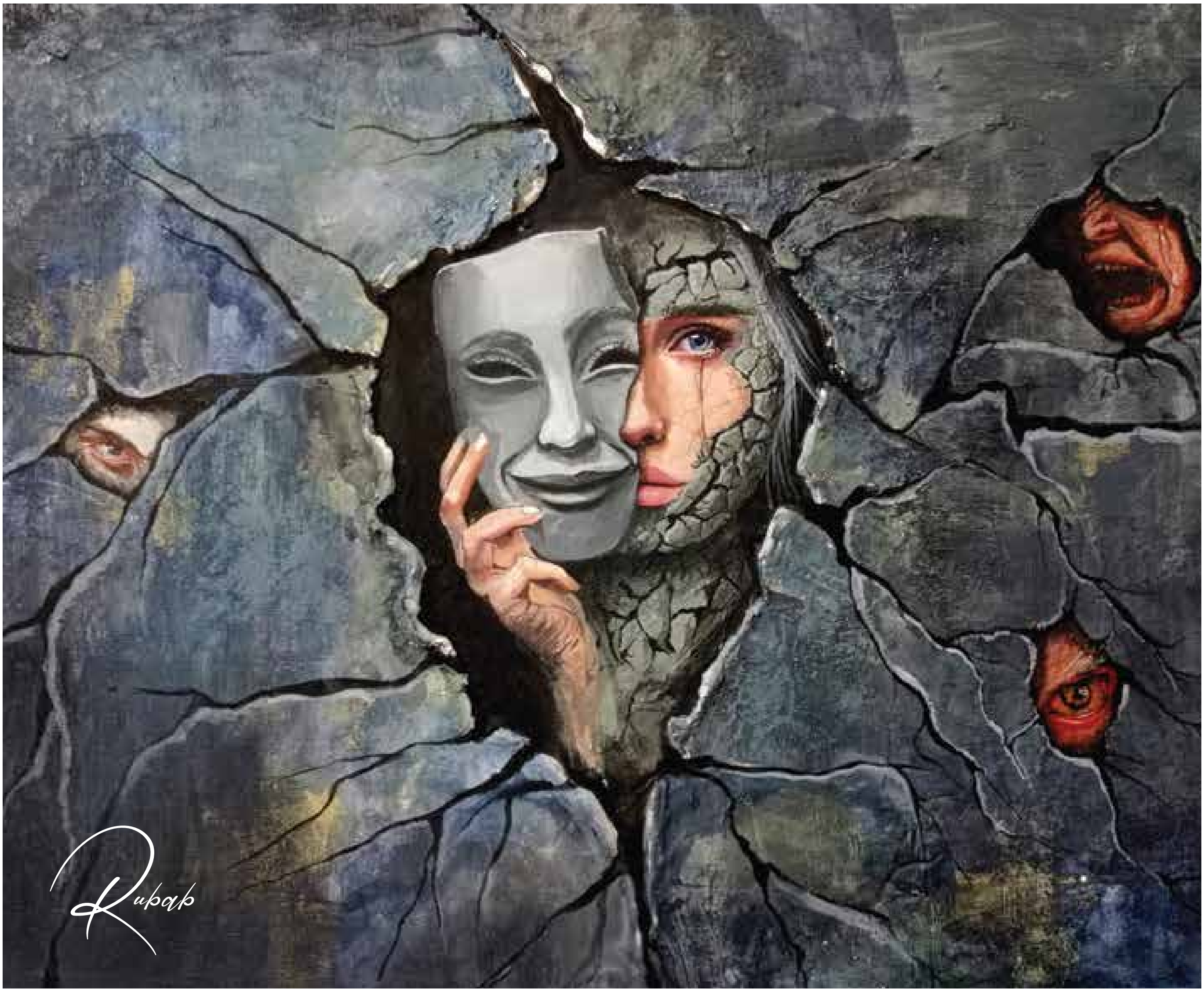
Rubab

Rubab

Rubab

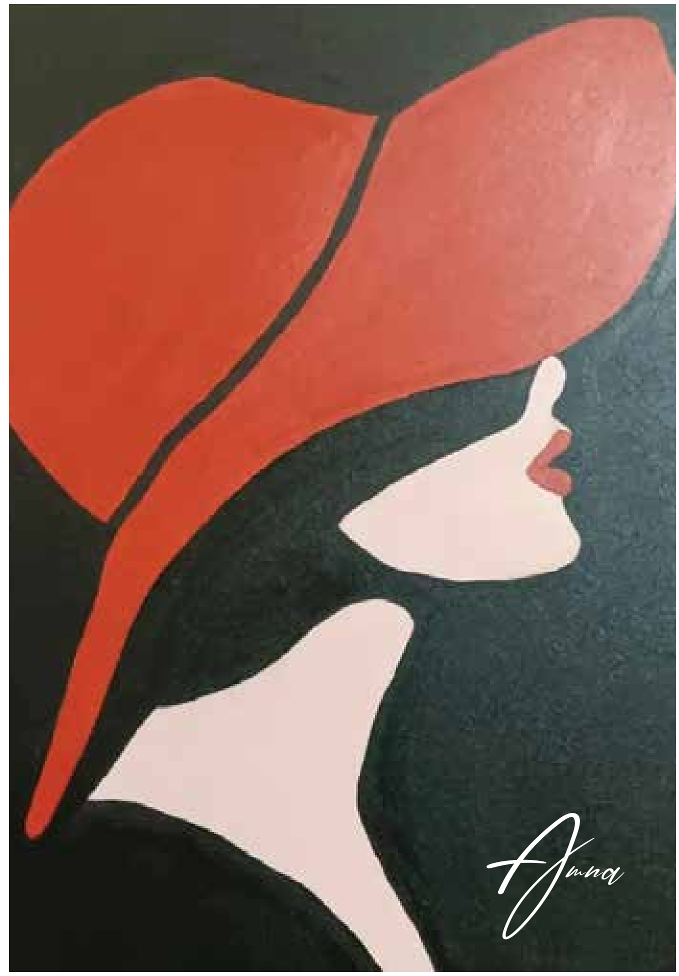
Amna

Amna

Marge Piercy's Woman on the Edge of Time (1976)

Dr Tasneem Kousar

What if the technology created to liberate us could also become the technology that controls us? This question lies at the heart of Marge Piercy's Woman on the Edge of Time (1976), a feminist speculative fiction. The novel takes readers into the troubled life of Connie Ramos, a poor Mexican-American woman whose experiences are shaped by poverty, racism, sexism, domestic violence, motherhood and institutional control. After an incident involving her niece Dolly and Dolly's abusive pimp, Connie is committed to a psychiatric institution. Inside the institution, Connie encounters doctors who claim to know what is best for her. Her body and mind therefore become objects of institutional power. Connie's reality suddenly opens onto another possibility. Through Luciente, a visitor from the future, she encounters Mattapoisett—a radically different society where gender inequality has been challenged, childcare is communal, reproduction has been technologically transformed and social life is organized around greater equality. Mattapoisett is not simply a technologically advanced version of contemporary America but entire social structure is different. Mattapoisett represents many feminist hopes of the 1970s.

Technology in the novel is not merely background. It becomes a literary metaphor for power like Brooder becomes possible liberation from biological constraints. Instead of pregnancy being exclusively carried by women's bodies, reproductive technology allows babies to develop outside the human womb. This has a major feminist implication. Piercy imagined a society where women could be freed from compulsory pregnancy. Piercy emphasizes on the transformation which liberates females from the obligation of reproduction and provides them a chance to master their own bodies. Piercy repeatedly makes the female body central to the narrative. Thus, the body becomes a literary site of power.

The novel presents exciting and interesting ideas regarding family system by challenging the traditional nuclear family system as in Mattapoisett, children are not dependent exclusively upon biological parents. Most notably, people aren't referred to by gender, they all use the non-gendered pronoun "per". All parents are mothers and all children are raised by three mothers, none of whom are directly biologically related. Childcare is communal. The idea of LGBT is also discussed by Piercy to deal with the problem of heterosexuality and male-female binary to break the strength of patriarchal norms, it depicts writer's knowledge about newly emerged voices of queer identities in the 70s. All individuals enjoy liberty as full individual. In Mattapoisett each person lives in a private tent or one-room home and adopted parents are in charge of providing care and upbringing until they reach puberty. Each individual chooses their own name, as well as the subject of study, career and beliefs that best suit their interests. Literary style of Woman on the Edge of Time is a blending of different genres, Piercy combines, social realism, feminist fiction, science fiction, utopian fiction, dystopian fiction, psychological fiction and political fiction. Piercy's writing is deliberately political because she does not hide her concern with, patriarchy, capitalism, racism,

class inequality, environmental destruction and institutional oppression. The large number of political ideas overwhelm the narrative and novel becomes overly didactic as Sometimes characters seem to explain Piercy's political ideas rather than behaving naturally. This book is particularly recommended for readers who are curious about the relationship between feminism, technology and society. It will appeal to students of literature, gender studies, social sciences and philosophy as well as anyone interested in questions of reproductive freedom, equality, institutional power and technological progress. Most importantly, it is a valuable choice for readers who do not simply want to imagine the future but want to know who will control it, whose interests it will serve and whether technological progress will truly make human life more free and what we might lose in the process

Woman on the Edge of Time remains highly relevant even today because some of the questions that Piercy raises have become more complicated and crucial with today's technologies. Mattapoisett uses technology to reduce oppression, particularly through reproductive technology but the alternative dystopian future uses technology for surveillance, exploitation, hierarchy and human commodification. This conflict is very contemporary because readers today face debates regarding AI, biotechnology, genetic engineering, reproductive technologies and data surveillance so recent scholarship specifically can continue to examine the novel through technology and instrumental rationality. Though the book is not easy read due to political and philosophical insights for common readers but overall the book did a good job of showing how social structure could turn out with several different and unique scenarios.

World War and World Peace in the Age of Digital Capitalism by Christian Fuchs

Fakiha Noor

Christian Fuchs's World War and World Peace in the Age of Digital Capitalism, published in 2025, is a roller coaster of a philosophical wake-up call and a digital-era tract that has the temerity to ask: Can peace endure the power of algorithms? How do violence and war manifest themselves in global digital capitalism? How do digital capitalism and digital technologies manifest themselves in violence and warfare? (Fuchs 2025, 2). The book is concerned with how digital capitalism amplifies international conflict and how peace needs to be re-imagined in a world dominated by data monopolies and algorithmic domination. Fuchs takes the detour of the resources from Galtung & Baurdrillard's detailed concept of violence to Marxist theory of socialism, with critical media studies and political philosophy, to contend that digital technologies are not impersonal instruments but prolongations of capitalist power that tend both to provoke and repress violence and knock at the door of "Toward Perpetual Peace" by Immanuel Kant.

The book deals with: (i) 'digital Militarism' (Fuchs, 2025, 69), the militarization of social media and surveillance technology in contemporary warfare (Russia and Ukraine), which is basically critiqued with the "Promethean Gap" by Anders; (ii) 'ideological polarization' (Fuchs, 2025, 193), which deals with how online spaces create extremism and destabilize democratic public discourse and makes a convergence

of an analysis of political and military global digital globalism, which focuses on China, NATO, the U.S., and Russia; (iii) and 'peace as praxis' (Fuchs 2025, 231), which reposes peace not as a political slogan but as an ethical demand grounded in human vulnerability and emancipation. When Fuchs says, "Digital capitalism is not just about profit—it is about control, domination and the potential annihilation of humanity" (Fuchs 2025, 7).

One of the most contentious assertions of the book is that digital capitalism is inherently predisposed to war. Fuchs contends that profit-motivated tech monopolies automatically side with militaristic causes. Although persuasive, this perspective threatens to oversimplify. Not every digital innovation contributes to conflict but some can promote international cooperation and peacemaking. Fuchs's critique of surveillance capitalism is strong but his rejection of tech's potential for peace rings one-sided. In addition to the counterpoint that Fuchs views digital platforms as instruments of oppression, others contend that they can empower mass movements and democratize information.

I Am an Arab: Poetry, Identity and Resistance in Marwan Makhoul

Qaisar Waheed

Marwan Makhoul is a Palestinian poet who was born on the 2nd of July, 1979, in the village of Beqai'a, Upper Galilee, a village that is not yet officially recognized, as it is one of the few Arab Palestinian villages to be established after the Nakba. Born to a Palestinian father and a Lebanese mother, he grew up in a family that was struggling to verify the existence of its emerging village. He was greatly influenced by his family's patriotic spirit and communist mentality. He was also involved in political activism and worked at the age of seven, along with his father, as a distributor for the Party's newspaper Al-Ittihad. After working for a while with his father in the field of construction, he left in order to forge his own path. Between his work in construction and that of literature, his personality's features grew clearer, causing his poems to reflect both the lived experience and the spirit of the street. Makhoul has several works published in poetry, prose, and drama, including his first work of prose, A Letter from the Last Man (self-published, 2002), his first play, This isn't Noah's Ark (Akka Theatre, 2009) and collections of poetry including Ard al-Bassiflora al-Hazinah (Land of the Sad Passiflora), published in 2011. His poems have been translated into many languages, and some of them have been turned into distinctive songs, documentaries and theatrical and artistic works. He is mainly investing his time in poetry-reading evenings and other musical poetry readings on local and international stages. In his poem An Arab at Ben Gurion Airport, Makhoul shows that even an airport is a necropolitical space where a Palestinian has to prove his identity, which is considered suspicious. The poem starts with a courageous announcement when the speaker says, "I am an Arab," which expresses his identity as well as satirically challenges a power structure that looks at an Arab Palestinian suspiciously. In the poetry of Makhoul, apart from the traditional meaning, the concept of

identity emerges as a complex and political process. According to his poetic voice, identity is not a fixed reality, but it is an unstable essence that is fractured and contested. In his poetry, Palestinian identity develops under the pressure of the politics of death, where the necropolitical state paralyzes life through check-posts and military siege. As the life and death of a Palestinian are in the hands of the necropolitical forces, he can never celebrate a complete identity. He shows that identity in Palestine is a production of racialized power structures that present the Palestinians as a racial threat. In Identity, he presents identity as a fractured and controversial entity that is actually a result of the pressure of necropolitical and racialized states. He adopts an interrogative and negative mode in the poem when he says, “I'm unfamiliar with refugee camps”, “I'm unfamiliar with tear gas” and “I'm unfamiliar with myself”. Identity appears as a process of negotiation where an individual is in a continuous process of shaping his identity. He raises questions about his identity and gives it new meanings in a new context. This negotiation is a continuous dialogue with the political, social, and historical powers. In this way, identity becomes such a site where different powers collide, and the identity of the individuals remains variable. Ultimately, his poetic voice demonstrates that identity crisis is a structural and organized reality that is maintained through a nexus of power and politics where the identity of a Palestinian is not recognized. He suffers from a suspended identity as his life is under the siege of the necropolitical government that deprives him of his human dignity. His poetry exposes the limits and weaknesses of frameworks imposed by the racialized power structures and demonstrate how necropolitics and race are connected with each other where the occupied forces use racial hierarchy as tool and decide the lives of the Palestinians. Language is also an important source to reclaim agency in Makhoul's poetry. The necropolitical power structures distort the voice of the oppressed and erase their stories through censorship and restrictions on narratives. They control their voice and deprive them of freedom of expression. In such circumstances, the poetic voice of Makhoul becomes a tool of resistance to reclaim agency. He narrates the stories of the Palestinians and preserves their identity and dignity through the power of his language in a controlled environment. At one side, his language is in danger under the powerful structure whereas at another side, it is an effective way of restoring agency. In his poetry, an alternative future is not separate from the past, but it emerges from the continuity of the past. It shows that the future is not a new beginning; it is the next chapter of a continuous story in which collective agency plays an important role, as it not only keeps the people alive but also strengthens them to imagine a brighter future. In conclusion, Makhoul's poetry demonstrates that poetry can become a powerful means of confronting erasure, racial prejudice, and the politics of death. Through irony, self-assertion, and the power of language, his poetic voice refuses to remain silent under structures that attempt to control Palestinian identity and existence. His poetry not only narrates the experiences of Palestinians but also preserves their dignity, agency, and collective memory. By connecting the struggles of the past with the possibilities of the future, he shows that poetry can keep people's voice alive and enable them to imagine a future beyond oppression and erasure.

systematic and critical English education more necessary than ever.

This transformation is consistent with Henry Jenkins's concept of participatory culture. Jenkins observes that digital media have blurred the distinction between producers and consumers of knowledge and have created environments in which people participate, create, share, and collaborate. He also argues that teachers remain important in such environments because they can guide students in evaluating information, developing strategies for research, and negotiating the ethical challenges of digital cultures. The implication for English studies is clear: students should not merely consume AI-generated language and literature; they should learn how to question, evaluate, revise, contextualize, and ethically use such material.

Indeed, the use of online resources for language learning predates artificial intelligence. Even before the emergence of generative AI, students were using Google, online dictionaries, pronunciation tools, grammar checkers, translation services, language-learning applications, and digital libraries to improve their English. AI is therefore better understood as an advanced extension of this technological development rather than as a completely unprecedented replacement for human learning. If Google did not eliminate libraries, teachers, universities, or academic disciplines, there is little reason to assume that AI will eliminate English language and literature studies. What it will do is change the way these subjects are taught and learned.

The most important transformation required is therefore curricular. English language and literature teaching must move beyond an excessive emphasis on traditional grammar, literary history, memorization, and the reproduction of established interpretations. These remain important foundations, but they need to be complemented by critical thinking, critical communication, AI-assisted writing, prompt literacy, AI-supported translation, digital discourse analysis, media literacy, and digital humanities. In this model, AI becomes a tool for enhancing English language and literary education rather than a technology for eliminating it.

Katherine Hayles's scholarship connects literature with digital technologies and has been particularly important to the development of digital humanities and electronic literature. From this perspective, AI should become a new object and instrument of English studies: students should learn not only how to use AI for writing but also how AI changes the concepts of authorship, creativity, interpretation, reading, and textuality.

For example, with the assistance of AI, it is

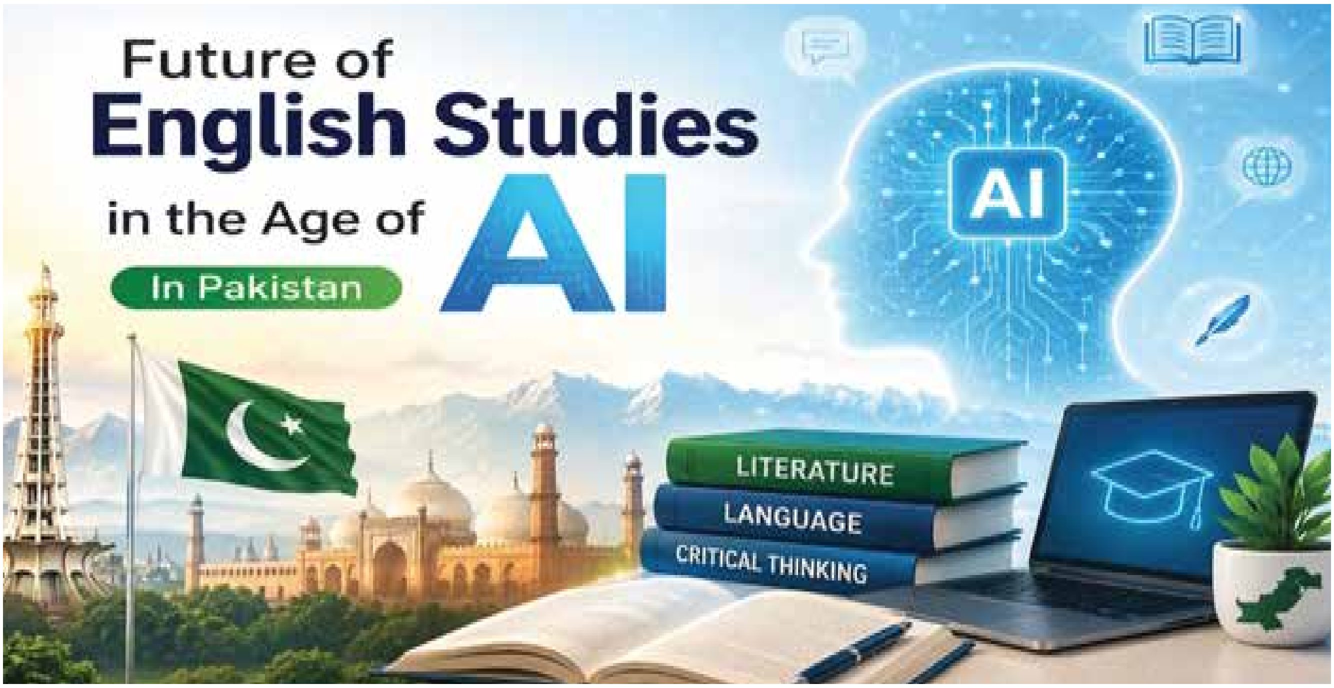

The changing nature of English in the digital age has already been recognized by linguists. David Crystal, one of the leading scholars of language and the Internet, argues that digital communication has created new varieties and forms of linguistic interaction rather than simply destroying traditional language. His work on Internet linguistics demonstrates that the Internet has become a new medium for linguistic creativity, communication, and language change.

Evidently, the use of the English language and the creation and circulation of English literature have spread far and wide through the democratization of communication on social media and digital platforms. A large number of people today have acquired the ability to use English for communication on social media and, increasingly, in their everyday lives. However, knowing or using

Dr. Zia Ahmed

English in this informal sense is not sufficient to justify discontinuing the teaching of English language and literature in the classroom. On the contrary, the advent of artificial intelligence (AI), which has extended the reach of English language and literature to almost everyone, makes

now possible to generate a sonnet, short story, essay, screenplay, or even a song within seconds. Yet the mere production of a text does not necessarily constitute literary creativity. Questions immediately arise about intention, experience, emotion, imagination, context, originality, authorship, and ethical responsibility. AI may produce technically competent language, but the human dimensions of literature remain subjects of critical inquiry. Consequently, the English professor is increasingly needed to help students distinguish between linguistic production and meaningful human expression.

Therefore, the role of the English language and literature teacher in the classroom has arguably become more significant than ever. The teacher is no longer simply a transmitter of information. The professor increasingly functions as an interpreter, facilitator, evaluator, mentor, and intellectual guide. Students need to learn how to identify multiple interpretations of a literary text, compare competing interpretations, examine the assumptions behind them, and construct their own arguments. When AI can instantly provide several interpretations of a poem or novel, the teacher's responsibility is to teach students how to evaluate those interpretations rather than simply accept the one that appears most convincing.

For Pakistan, the significance of English language and English studies may be even greater in the emerging digital future. English provides Pakistani students and scholars with access to international academic communities, global research, digital resources, professional networks, and international scholarship. It enables students to communicate with researchers and institutions beyond national boundaries and to participate more effectively in global academic and technological conversations. At the same time, English provides access to an enormous body of knowledge in science, technology, business, media, and the humanities. Consequently, the importance of English in Pakistan is unlikely to decline; rather, its role may become more interdisciplinary and technologically oriented.

Consequently, university departments of English need to become increasingly interdisciplinary. They can bring together literature, language, linguistics, artificial intelligence, media studies, communication, digital humanities, cultural studies, and computational approaches to language. Such an interdisciplinary environment would not diminish English studies; it would renew them. English departments should become places where students learn not merely how to use English but how English functions in an increasingly technological, global, and algorithmic world.

The Art of Paying Attention

By: Muhammad Saad Aslam
Assistant Registrar,BGNU Nankana Sahib.

This is an invisible crisis taking place within the walls of universities, but it has nothing to do with the design of the curriculum or teacher shortage. It is all about the lack of attention. Young people spend hours sitting in lecture halls with their physical presence but not being mentally there, browsing their social media, responding to notifications, switching between ten browser windows. Once considered to be the most fundamental prerequisite for intellectual life, the capacity to concentrate on a single idea for a considerable amount of time is now regarded as a rare ability.

This problem is not generational. In a great deal, it is intentional. Today's platforms and apps, which define the lives of the youth, were developed by some of the best behavioral scientists out there. Each message, each "like", each swipe on an algorithmically chosen photo is designed to induce a little dopamine rush, enough to keep you coming back for more, but never enough to fully satisfy you. It has led to a generation that is at once the most connected and most distracted in history.

For a university student, there are grave implications. Deep learning, the type of learning that allows for true comprehension, demands intense focus. To read an intricate text, to struggle with a complex argument, to think about a problem until its solution becomes clear, none of this can happen in someone who has acquired the need for constant stimulation. As Simone Weil once noted, attention is one of the purest acts of generosity. It has become increasingly difficult for us even to practice this generosity towards ourselves.

The very city housing this university has, within it, a long-standing tradition of contemplation. This very soil from where Guru Nanak Dev Ji, had started his spiritual journey, had got a degree of attention which was far beyond the intellectual realm. His focus was not only intellectual but rather devout and transformative in nature. The very process of 'Ardaas' entails complete concentration towards something larger. This tradition teaches us a lesson which needs no introduction in the context of the modern-day student. Focused attention is not simply a skill of mind but that of reverence.

Perhaps it would be worthwhile to consider what exactly we miss out on when we fail at paying attention. What we miss out on, for example, is the ability to sit down and get lost in a book. We miss out on the skill and art of listening to someone else in their entirety without planning our reply. We miss out on the hard work and grind of learning something in its entirety without being able to learn a hack or shortcut for it, something that takes years and is not reduced to a social media reel.

This is by no means an argument for rejecting technology and returning to a past. Digital literacy itself is a vital skill to develop in the modern world, and technology has democratized access to knowledge in truly remarkable ways. The argument is not against technology, but for intent, for creating an intentional approach to our tools instead of simply using them as they come.

In practice this might translate into setting aside time every day to read with no screen in sight. This can be attending a lecture without having the phone in hand. Maybe it means sitting through a few minutes of boredom instead of rushing off to find a distraction, because boredom, it seems, is often the waiting room of creativity.

Universities have come into existence on account of the realization by humanity somewhere down the line that certain types of knowledge and wisdom were worth pursuing patiently and thoroughly. This is why Baba Guru Nanak University, which has been named in honor of an individual who searched for truth through great perseverance, bears this burden with all earnestness. Its students inherit not only a degree but also a legacy of earnest inquiry.

The outside world will always be noisy. The notifications will keep coming. However, the students who, during these years, learn to stay quiet, to read attentively, to think profoundly, and to focus intently hold something within them that cannot be replicated or replaced by any algorithm.

A Tribute to Late Dr. Naseeb Ahmad

Inna lillahi wa inna ilayhi rajiun

With profound grief, deep sorrow and a heavy heart, the Department of Physics, Baba Guru Nanak University, Nankana Sahib, mourns the tragic and untimely passing of Late Dr. Naseeb Ahmad, Associate Professor and Chairperson, Department of Physics. His sudden death in a tragic road accident at about 11:00 p.m. on Saturday, 13 June 2026, involving a loader trolley on Farooqabad-Manawala Link Road, has left the entire department, university community, students, colleagues and friends in a state of shock and deep sadness. In this tragic incident, his sister-in-law also lost her life, while his brother was severely injured. We pray that Allah Almighty grants the departed souls the highest ranks in Jannat-ul-Firdous and blesses the injured with complete and speedy recovery. Ameen.

The Department of Physics, in collaboration with the Physics Society, organized a Quran-Khawani for the departed soul of Late Dr. Naseeb Ahmad on Monday, 15 June 2026. Baba Guru Nanak University also organized a condolence reference in memory of Late Dr. Naseeb Ahmad on Wednesday, 17 June 2026 in the University Seminar Hall, to pay tribute to his valuable contributions to academia, the university, and humanity at large. The event was attended by faculty members, administrative officers and students who gathered to honour his services and express their grief over his untimely demise. The family of Late Dr. Naseeb Ahmad also participated in the condolence reference, including Mr. Saad Ahmad Ishaq (son), Mr. Abdul Hameed (brother) and other family members. Dr. Hashim Farooq moderated the proceedings of the condolence reference.

Dr. Naseeb Ahmad (late) will be remembered for the beauty of his character and the sincerity of his personality. His humility, generosity, sincerity and human values made him not only a respected teacher and scholar but also a deeply loved and admired person.

Late Dr. Naseeb Ahmad will always remain in our prayers, our memories and the history of the Department of Physics, Baba Guru Nanak University.

May Allah Almighty forgive his shortcomings, elevate his ranks, and grant him eternal peace. Ameen.

Dr. Hashim Farooq
Department of Physics,BGNU, Nankana Sahib